ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اپریل ۲۰۱۷ء

ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام	امت مسلمہ کا مشن دعوتِ حق ہے	محمد عارف ندوی	
۲-	اداریہ	فکری زاویے اور سیکولر و کمیونل سب ایک ہوگئے	مدیر	۳
		دعوت و تبلیغ کا جامع نظام......		۸
۳-	پیامِ سیرت	قرب جاناں کی تڑپ	محمد فرید حبیب ندوی	۱۴
۴-	نقطۂ نظر	چمن سرور کا جل گیا	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۶
۵-	شخصیات	ہم مگر سادگی کے مارے ہیں......(ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۱۹
۶-	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۱۳)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۰
۷-	خاص تحریر	میانمار-ایک مطالعہ	شان محمد ندوی	۳۴
۸-	چشم کشا	مدارس سے باصلاحیت افراد کیسے مل سکتے ہیں؟	مولانا محمد سالم قاسمی	۴۵
۹-	لائحۂ عمل	مالداروں اور مدارس کے ذمہ داروں سے چند گذارشات	محمد قمر الزماں ندوی	۴۷
۱۰-	زبان و ادب	مولوی سید احمد دہلوی	رشید حسن خاں، پیشکش: محمد شعیب ناگپوری	۴۹
۱۱-	تعارف و تبصرہ	مشعال المصابیح شرح مشکاۃ المصابیح	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی	۵۳
		قیام امن اور اسلام	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۸
		شعرائے بھٹکل کی نعتیہ شاعری	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۶۰
		علی گڑھ کی اردو صحافت، عہد بہ عہد	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۶۱
۱۲-	مکتوبات	حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا ایک خط	پروفیسر عبد الرحیم قدوائی	۶۳
۱۳-	آخری صفحہ	نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر	م-ق-ن-	۶۴
	شعر و ادب	اپنے دامن کے لئے خار چنے خود ہم نے	حفیظ میرٹھی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

اور سیکولر و کمیونل سب ایک ہو گئے

اتر پردیش انتخابات کے نتائج سب کے سامنے ہیں، اس کی تفصیل میں جانا تحصیل حاصل ہے، فتح وشکست کے اسباب متعدد ہو سکتے ہیں، اس سلسلہ میں لوگوں کی آرا مختلف ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ہم مجبور، بے بس اور بے کار ہیں، ہم نے معلوم نہیں کتنی بار یہ لکھا ہے کہ عالم اسباب میں بغیر اسباب اختیار کیے کسی کامیابی کی امید کرنا یکسر عبث اور فضول ہے، یہ سنت الٰہی کے خلاف ہے، خدا کا قانون ہے و أن ليس للانسان إلا ما سعى، جو کوئی جیسا بوئے گا ویسا کاٹے گا، یہ ممکن نہیں کہ بوئے پیڑ ببول کا اور کھائے آم، ہم نے اپنی حیثیت کھو دی، ہم ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک اپنے آپ کو تعلیمی، سیاسی اور حد یہ ہے کہ سماجی اعتبار سے بھی مستحکم نہ کر سکے، غلامی نے ہمارے دل ودماغ کو آج بھی جکڑ رکھا ہے، جس کے نتیجہ میں ہم ہر جگہ سہارے ڈھونڈتے ہیں، قوم کی اکثریت ان پڑھ ہے، سیاسی اعتبار سے غلامانہ ذہنیت رکھتی ہے، سماجی اعتبار سے امت دعوت ہونے اور شہادت حق کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود سب سے کٹی ہوئی اور سب سے الگ تھلک پڑی ہے، جبکہ قرآن مجید کے بیان کے مطابق اس امت کی تخلیق ہی ''لوگوں'' کے لیے کی گئی، كنتم خير امة اخرجت للناس، حضور اکرمؐ نے بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد خدمت خلق اور خدمت انسانیت کو اپنا مشن بنائے رکھا، اس کے ذریعہ لوگ مانوس ہوتے رہے اور پھر آپ دعوت حق پیش کرتے رہے، مکہ مکرمہ کی اس انتھک محنت کے نتیجہ میں مدینہ کی ریاست قائم ہوئی اور مسلمانوں کو استحکام وسکون حاصل ہوا، عہد مکی میں نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی نبی اکرمؐ کی پہچان کیا تھی، یاد کیجیے حضرت خدیجہؓ کے وہ الفاظ جب حضورﷺ پہلی وحی کے بعد گھبرائے ہوئے آئے تھے تو حضرت خدیجہؓ نے کن الفاظ میں آپ کو تسلی دی تھی۔ كلا والله ما يخزيك الله أبدا إنك لتصل الرحم وتحمل الكل تكسب المعدوم وتقرى الضيف وتعين على نوائب الحق۔ (ہرگز ہرگز اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا، آپ رشتہ داری کا لحاظ رکھتے ہیں، دوسروں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں محتاجوں کے کام آتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، راہ حق کی تکالیف میں مددگار رہتے ہیں۔)

ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے تعلیم کے مسئلہ پر بھی توجہ نہیں دی، سیاسیات، سماجیات وصنعت اور تمام شعبہائے زندگی میں اغیار کی غلامی کو اپنا مقدر سمجھ لیا، امت دعوت کے واجبی فریضہ سے آنکھ چرائی، دین کو مسجد ومدرسہ میں محدود کر دیا، دعوت کو خاندان و

برادری میں قید کر دیا، اور انسانیت نوازی، غم خواری وغم گساری کے ذریعہ انسانوں کے دل جیتنے کا کام بھی دوسروں کے لئے چھوڑ دیا، پھر سیاست سے ایسی دوری اختیار کی کہ بالکل بے وزن ہو کر رہ گئے۔

ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم نے عہد مکی میں رہنے کا عزم مصمم کرلیا ہے، اسی لیے تو ہم عہد مکی کی اکثر وبیشتر محنتوں سے جی چراتے ہیں، جزئیات میں الجھ کر اپنی توانائی تباہ کرتے ہیں، ہمیں اس کلمہ کی حقیقت پر ایمان رکھتے ہوئے اس اعتبار سے محنت کرنی ہوگی کہ دنیا ہمارے دین کی شیدائی ہوجائے، نبی پاک علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کی اقلیت کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کلمة تقولونها تملکون بها العرب والعجم.

فیصلہ آچکا ہے، اس حقیقت کو قبول کرنا چاہیے کہ یہ الٰہی فیصلہ ہے اور ہمارے لیے تازیانہ عبرت ہے، اس کا مقابلہ کرنا اور مستقبل کی تیاری کرنا مومن کی شان ہے، ڈر اور خوف کی نفسیات میں جینا مومن کا طریقہ کار نہیں، اس کی شان ولم یخش إلا الله ہے، اس کی نفسیات ولا تقنطوا من رحمة الله، وہ حالات کا تجزیہ کرتا ہے، خدا پر یقین رکھتا ہے، اور اسباب اختیار کرتے ہوئے آگے کا سفر طے کرتا ہے، اس لیے ڈرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں، یہ سوچیے کہ غلطی کہاں ہورہی ہے، کمزوری کہاں ہے، سوراخ کہاں ہے، کمزوری ایمان کی ہے، کمزوری غلامانہ نفسیات کی ہے، کمزوری سیاست سے کٹ جانے اور سماج کی طرف متوجہ نہ ہونے کی ہے، سماج کی خدمت کو شعار بنایا جائے اور سہارے ڈھونڈنے کے بجائے خود دوسروں کا سہارا بن کر میدان میں عمل میں قدم رکھا جائے تو کامیابی یقیناً ملے گی، ہم وانتم الأعلون کی ہر آن خواہش رکھتے ہیں مگر ان کنتم مومنین کی شرط پوری کرنے کو تیار نہیں، جب تک ایمان کے تقاضے پورے نہیں کیے جائیں گے، غلبۂ وسکون اور امن واستحکام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ دل میں مواحدانہ نظام کی تمنا رکھتے ہوئے معاہدات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سماج کی خدمت کی جائے اور اس طرح سیاسی فتح کی راہ ہموار کی جائے۔

اس حقیقت کو تسلیم کیجئے کہ ہمارے یہاں تو مفکرین ہیں جن کا کام بیٹھے رہنا اور ٹانگیں کھینچنا ہے، یا تو وہ بے حس لوگ ہیں جن کا ملی شعور نہ بالغ ہوا تھا نہ بالغ ہونے کی امید ہے یا پھر وہ مفاد پرست ہیں جو چڑھتے سورج کو سلام کرنے اور اپنے جزوی ووقتی مفادات کو حاصل کرنے کے عادی ہیں، ان کی مفاد پرستانہ سیاست، اجتماعی وملی شعور کا فقدان اور مفکرین کی بہتات نے ہمارا وجود ختم کر دیا ہے، تو اگر اب ایسا نتیجہ آیا تو آخر تعجب وحیرت کیوں ہے؟؟ واقعہ یہ ہے کہ

متاع دین ودانش لٹ گئی اللہ والوں کی یہ کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی
وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

ذرا غور کیجئے کیا اعلیٰ ملی قیادتوں نے کوئی متحدہ لائحہ عمل تیار کیا تھا؟ کیا مسلم تنظیموں نے کوئی زمینی کام کیا تھا؟ کیا کوئی پالیسی اختیار کی گئی؟ اگر نہیں تو پھر یہ تو پرانی روایت رہی ہے کچھ سماجوادی ہیں، کچھ بسپائی ہیں، کچھ کانگریسی ہیں، کچھ زرخرید ہیں، جو ملت کا

سودا کرتے ہیں، مفادات کا سودا کرتے ہیں جذبات کا سودا کرتے ہیں، ان کی تعداد عہد رسول سے لے کر اب تک رہی ہے اور رہے گی، اب اگر ان گناہوں کے مرتکب مجرموں کو یہ سزا نہیں ملے تو اور کیا انہیں گلدستے اور مٹھائیاں پیش کی جائیں، یہ تو ایک ٹھوکر ہے اور بڑی ٹھوکر ہے، اگر اب بھی عقل ٹھکانے نہ آئی تو تیار رہیے آنے والے وقت میں راجیہ سبھا کی اکثریت کے بعد صدارتی نظام کے نفاذ کے لئے اور صدر اول ''حضرت مودی'' کے استقبال کے لیے، راجیہ سبھا کی اکثریت پہلا قدم ہے اور صدارتی نفاذ کا نظام ہندستان ہندو راسٹر بنے نہ بنے مگر مسلمانوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنانے کے لئے دوسرا قدم ہوگا، ہم جن جرائم اور گناہوں کے مرتکب ہو رہے ہیں ان پر نظر ڈالیے اور قرآن کی یہ آیت پڑھیے: قل هو القادر على أن يبعث عليكم عذابا من فوقكم أو من تحت أرجلكم أو يلبسكم شيعا ويذيق بعضكم بأس بعض انظر كيف نصرف الآيات لعلهم يفقهون (انعام۶۵) (کہہ دیجئے کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب بھیج دے یا تمہارے پیروں کے نیچے سے، یا تمہیں گروہ در گروہ کر کے آپس میں جنگ کا مزہ چکھائے، دیکھیے کہ ہم کس کس طرح باتیں سمجھا رہے ہیں تا کہ یہ ٹھیک سے سمجھ لیں) بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اوپر سے عذاب کی ایک سورت یہ بھی ہے کہ ظالم حاکم مسلط کر دیے جائیں اور نیچے سے عذاب کا مطلب یہ ہے کہ ماتحت بغاوت و کام چوری کرنے لگیں یہ بھی عذاب ہے کہ آپس میں لڑتے بھڑتے رہیں، تقسیم ہوتے رہیں اور مفادات کی روٹیاں کھاتے رہیں تو پھر اس عذاب کے نتیجے میں وہ عذاب بھی آئے گا جس کا تذکرہ کر کے قرآن نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہم تو ہر طرح سے سمجھا رہے ہیں تا کہ یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ ہے، اب ذرا دوسرا رخ دیکھیے لیکن دوسرا رخ دیکھنے سے پہلے ہمارے فروری کے اداریہ کا یہ اقتباس پڑھنے کی زحمت گوارا کیجئے:

> ''وہ ایک شخص جس نے عین وقت میں بہار میں دھوکہ دیا تھا اور فسطائی جماعت کی راہ ہموار کرنے کا جھنجلاہٹ میں ہی صحیح، مگر اعتراف کیا تھا، اس نے یوپی میں بھی عین وقت پر ایک ڈرامہ اسٹیج کر دیا اور اپنے بس بھر پوری کوشش کر دی کہ اپنے آقاؤں کے لیے راہ ہموار کر دے، اب مسلمانوں کی تقسیم تو طے ہے، کیوں کہ ہمارے درمیان کچھ وہ ہیں جنھوں نے باپ کے یہاں دعوتیں کھائی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو بیٹے سے افطار پارٹی کے دعوت نامے طلب کرتے رہے ہیں، رہ گئیں دوسری جماعتیں تو چارہ ڈالنے میں وہ بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں اور نشتر لگانا تو سب کا اجتماعی اور مشترک عمل ہے، مسلمانوں کا ووٹ قربانی کے گوشت کا ایک ڈھیر ہے، سب اپنا اپنا حصہ تقسیم کر لیتے ہیں، البتہ نہ رضائے الٰہی مقصود ہوتی ہے اور نہ اس کا خیال، پھر کوئی ثواب نہ ملے تو شکوہ کیسا۔
>
> بظاہر چوہے بلی کا کھیل ختم ہو گیا ہے، باپ چاروں خانے چت ہو گیا اور بیٹا فتح یاب، مزید یہ کہ

آزادی سے اب تک استحصال کرنے والی جماعت سے اتحاد کا بھی قوی امکان، حکمراں جماعت میں جشن کا ماحول ہے، مگر لکھنے والے نے صحیح لکھا ہے ''......لیکن عوام پر اس لڑائی کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ تو گیارہ مارچ کو معلوم ہوگا''، کیوں کہ ہم کو اب بھی اس کا یقین ہے کہ یہ کھیل کہیں نہ کہیں کسی اور کی نفع رسانی کے لیے سوچی سمجھی سازش کے تحت کھیلا گیا ہے''

اب ذرا دیکھیے سیکولرزم کا مکھوٹا لگانے والے منافق کس طرح فرقہ پرستی کے ہمنوا بن گئے، سوالات ہیں اور بہت اہم ہیں، جن کی تہہ میں آپ پہنچیں گے تو سوچنے پر مجبور ہوں گے، واقعہ یہی ہے کہ ہم اپنی ذہنی، فکری غلامی اور ہماری گزشتہ تعبیر کے مطابق ''سیاسی افلاس'' کے سبب منتشر ہوکر بے قیمت ہوگئے، اور سیکولر و کمیونل ایک ہوگئے، لیکن پھر بھی ہم یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ یہ نتائج صرف ہمارے انتشار کے سبب نہیں آئے، ہماری تقسیم سپا و بسپا میں ہمیشہ ہوتی رہی اور بے وزن بیانات بھی ہمیشہ آتے رہے پھر آخر کیا وجہ رہی کہ نتیجہ اس طرح کا آیا، یادو ووٹ کہاں گئے، دلت کٹر ہندو کیوں بن گئے، ووٹ فیصد کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض سیٹوں پر دس سے پندرہ فیصد مسلم ووٹ بی جے پی کو ملا ہے جس کا شیعہ اکثریتی علاقوں میں تو امکان ہے مگر دیوبند جیسی سیٹ پر ہرگز اس کا امکان نہیں، پھر بھی افسوس ہے کہ ہم الزام اپنے سر خود ہی لے رہے ہیں، پہلے بھی کچھ نہیں کیا، اب بھی کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں، یہ موقع تھا سیکولر کا نعرہ لگانے والوں کو آئینہ دکھانے کا تو ہم الزام خود پر دھرنے لگے، سچ کہا گیا ہے ؎

قوت فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے
تب کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے

ذرا ان اسباب پر غور کیجئے:

- جو اتحاد کیا گیا وہ خود ہار کا سبب بن گیا ہم یہ بات پہلے سے کہہ رہے تھے مگر اب سیاسی گلیاروں میں بھی اس کی بازگشت ہے، آج کا اخبار اس کا گواہ ہے کہ کانگریس سے اتحاد سماجوادی کو لے ڈوبا، کانگریس تو خود مردہ تھی، اس سے اتحاد ''کام بولتا ہے'' کا نعرہ لگانے والوں کی کمزوری کی علامت بن گیا۔
- کاشی رام نے سماج وادی سے اتحاد کر کے زعفرانیوں کو زبردست شکست دی تھی اور یہ کہا تھا کہ ہم نے ''منوواد'' کو شکست دینے کے لئے سماجوادی سے ہاتھ ملایا، اگر ملائم مخلص تھے تو پھر ملائم و مایا کے ساتھ متحد کیوں نہ ہوئے۔
- پھر اتحاد بھی ایسا کہ کچھ سیٹوں پر دونوں حلیف فریق بن کر آمنے سامنے۔
- بعض جگہوں پر یقینی طور پر جیتنے والوں کو روک کر نئے چہروں کو سامنے لایا گیا اور فائدہ اس کا ہوا جس کو فائدہ پہنچانا مقصد تھا، دو دو مرتبہ کے جیتے امیدواروں کو ٹکٹ نہ دیے کر نئے امیدوار لائے گئے۔
- مرکز کی تاناشاہی اس قدر مضبوط ہے کہ اس کے آگے دھیرے دھیرے سب ہتھیار ڈال رہے ہیں، یہی نہیں بلکہ سب آر

ایس ایس کی شاگردی کا حق ادا کر رہے ہیں، نیتا جی کے بارے میں ہم نے پہلے ہی لکھا ہے کہ وہ قریب ترین شاگرد ہیں اور اب انہوں نے واضح ثبوت پیش کر دیا، اس حکومت کی ابتدا میں اور پھر لوگ سبھا، الیکشن میں اس کی مثالیں اور تصویریں منظر عام پر آ چکی ہیں، یہ بات ہم ہی نہیں متعدد تجزیہ نگار اب کہہ رہے ہیں۔

- عین الیکشن سے قبل امر سنگھ کی شمولیت کیوں ہوئی۔
- خاندانی جھگڑا کیوں ہوا، ملائم سنگھ پورے الیکشن میں روپوش کیوں رہے، کتنا باخبر تھا انقلاب کا ایڈیٹر جس نے لکھا تھا ''لیکن عوام پر اس جھگڑے کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ تو گیارہ مارکو معلوم ہوگا''۔
- ایس پی و بی ایس پی دونوں نے ہر مسلم علاقہ میں دل کھول کر مسلمانوں کو کیوں اتارا۔

یہ اور اس سے جیسے متعدد سوالات ہیں جن کے جواب ہمارے اس نظریہ کو صاد کرتے ہیں کہ یوپی کو ایک تھال میں رکھ کر احترام کے ساتھ سونپنے کا کام سب نے مل کر کیا ہے، جس میں سرفہرست ملائم سنگھ اور اکھلیش یادو ہیں جنہوں نے لوک سبھا الیکشن میں ہی اپنا مسئلہ طے کر لیا تھا، پورے یوپی میں بی جے پی تھی مگر سونیا، راہل اور ملائم کے خاندان سے ۵ ایم پی لوک سبھا پہنچ گئے تھے، میرے دعوے کی حقیقت جب کبھی واشگاف ہوگی تو آنکھیں کھل جائیں گی، ہمارا یہ یقین ہے کہ ساری جماعتوں نے مل کر بی جے پی کو الیکشن لڑوایا ہے، مایاوتی کے کیڈر نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے، مجھے اس وقت نتائج دیکھ کر اویسی کی وہ بات یاد آ رہی ہے جو الیکشن سے قبل ایک نشست میں کہی تھی کہ اس انتخابات مین بی جے پی کا مقصد اپنی فتح سے زیادہ مایاوتی کی ہار ہے تا کہ ۲۰۱۹ء کے الیکشن میں سارا دلت ووٹ اس کو ملے، مگر اب تو دونوں ہاتھ میں لڈو ہیں فتح بھی تاریخ ساز اور دلت ووٹ لینے میں بھی کامیاب، اب بھی وقت ہے کہ اچھی طرح یہ بات سمجھ لی جائے کہ صرف چہرے الگ ہیں لیکن دل، دماغ ایک ہے، کام کرنے کا طریقہ کچھ الگ ہو سکتا ہے۔

جب سب ایک ہو گئے تو پھر ای وی ایم مشین نے بھی اپنا کمال دکھایا، ای وی ایم جسے ترقی یافتہ یورپ رد کرتا ہے، بعض ممالک میں ای وی ایم کے ذریعہ کرائے گئے انتخابات بھی رد کیے گئے تو پھر ہمارے یہاں اس کا استعمال کیوں، سپریم کورٹ کے نوٹس کے باجو پیپر ٹیل مشین کیوں نہیں لگائی گئیں، الیکشن کمیشن نے بوتھ پر ووٹنگ کے متعلق معلومات گیارہ مارچ سے پہلے دینے سے کیوں انکار کیا؟ لیکن ان سوالات سے کیا فائدہ، جواب مل بھی جائے تو ہم کیا کر لیں گے، اور اب تو سوشل میڈیا پر یہ ویڈیو بھی وائرل ہے کہ حیدرآباد کے ہری پرشاد کو اس الزام پولیس نے گرفتار کیا گیا ہے کہ انہوں نے ٹی وی کیمرے کے سامنے یہ واضح کر دیا کہ ای وی ایم کو اپنے مقصد کے لئے کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ ووٹ فیصد کے تجزیہ سے ہمارا یقین مضبوط تر ہو گیا ہے کہ لوک سبھا اور یوپی میں ای وی ایم کا کمال ہے، اگر لہر ہوتی تو ملک کا وزیراعظم تین دن بنارس میں رہ کر گھر گھر نہ جاتا۔

اب کرنے کا کام وہی ہے جو ہم لوگ سبھا میں بی جے پی کی کامیابی کے بعد بھی لکھ چکے ہیں کہ ''سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر درست نہیں''، دعوتی نقطۂ نظر سے ان کے قریب جایا جائے، سیکولرزم کے فریب میں پھنس کر فرقہ پرستی کو فروغ نہ دیا جائے، جس

قدر سیکولرزم کی رٹ لگائی جائے گی، اسی قدر فرقہ پرستی فروغ پائے گی، اب سیکولرزم کا نفاق بھی طشت از بام ہو گیا، اب بات سامنے آ گئی تو جن سے کھلا ہوا مقابلہ ہے ان سے بات ہونی چاہیے، انسانی نقطۂ نظر اور دعوتی ذمہ داری کو سمجھتے ہوئے تعلقات استوار کرنے چاہیے، سیرت اور پوری تاریخ میں لڑائی اور معاہدے سب دشمنوں سے ہوئے ہیں، منافقوں سے نہیں، منافق تو ہمیشہ آستین کا سانپ بن کر ڈستے رہے ہیں، پھر اب تو ان کا نفاق بھی کھل گیا ہے، اگر نہیں! پھر ایسی ہار انہوں نے کس طرح قبول کر لی اور خاموش ہو گئے جس میں بے شمار شواہد ای وی ایم گھوٹالے کے موجود ہیں، ایک بیان بھی نہ جاری کر سکے، یہی ۱۴ میں کانگریس نے کیا اور یہی اب یوپی کے ''شہزادے'' کر رہے ہیں۔

ہم ایک اداریہ ''ہندو مذہب اور دعوت اسلامی کے امکانات'' اور دوسرے اداریہ ''ایک مجرم کی طرح اہل وفا بیٹھے ہیں'' میں اپنے اس نقطۂ نظر کو بہت اچھی طرح واضح کر چکے ہیں، اب ضرورت اس کی ہے کہ واویلا مچانے، خوف و ہراس کا ماحول بنانے کے بجائے امت دعوت کی ذمہ داری نبھائی جائے، مسائل کو حل کرنے کے بارے میں سوچا جائے، سیاسی افلاس پر قابو پانے کے لیے ابھی سے آئندہ کی پالیسی خاموشی کے ساتھ تیار کی جائے، سیکولرزم اور کمیونلزم کی پر فریب اصطلاحات سے نجات حاصل کی جائے، بہت تیزی کے ساتھ ہندی اور دیگر علاقائی زبانوں میں ایسے کتابچے تیار کیے جائیں اور پھیلائے جائیں جس سے ہماری تصویر صاف ہو کہ ہم نے اس ملک کو تجارت دی، صنعت دی، معیشت دی، رہن سہن کا طریقہ دیا، فن معماری سے آشنا کیا، اندھیرے سے اجالے کی طرف لائے، ابھی تک ہم پیغام حق سنانا تو دور اپنا تعارف بھی نہیں کرا سکے، اس لیے یہ تصور عام ہے کہ مسلمان خود پرست، لٹیرے اور متشدد ہوتے ہیں، لوگوں کو بتایا جائے کہ مسلمان نرم دل، رحیم، بردبار ہوتے ہیں، انھیں اکڑ کر چلنے سے بھی منع کیا گیا ہے، لوگوں کے ساتھ میل جول بڑھایا جائے، ان کے لیے منصوبے بنائے جائیں اور پروگرام چلائے جائیں، اصلاح سے اوپر اٹھ کر تبلیغ کی ذمہ داری نبھائی جائے، انسانیت کی خدمت کی تحریک چلائی جائے، سوشل ورک کے ذریعہ دلوں کو فتح کر کے آئندہ کی راہ ہموار کی جائے، حادثہ اگر واقعی سخت ہے، جو ہوا ہے اگر واقعی بہت برا ہوا ہے تو کیا ارباب حل وعقد اب ایک ساتھ بیٹھ کر مستقبل کے لیے کچھ سوچیں گے، کوئی لائحہ عمل طے کریں گے؟ یہ سوال بہت اہم ہے، پوری ملت جواب کی منتظر ہے۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

دعوت وتبلیغ کا جامع نظام، قرآن اور سیرت کی روشنی میں

قرآن ایک آفاقی کتاب ہے، اس کی شریعت ایک آفاقی وعالمی شریعت ہے، اس کو لانے والے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ عالمی نبی ہیں، آپ کو ساری دنیا کی اصلاح کے لیے بھیجا گیا، اور یہ فرما دیا گیا ''قُلْ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ

اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا''(اعراف:۱۵۸)''کہہ دیجئے کہ انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا پیامبر ہوں'' اور وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِیْن (انبیاء:۱۰۷)''اور ہم نے آپ کو تمام طبقات کے لیے رحمت بنایا ہے'' پھر آپ کو حکم دیا گیا يا أيها المدثر قم فانذر، (مدثر:۱،۲)''اے چادر اوڑھ کر (لیٹنے والے) کھڑے ہو جاؤ'' آپ کو تبلیغ کی تلقین کی گئی اور اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے آپ کو ان الفاظ میں تاکید کی گئی یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَه. (مائدہ:۶۷)''اے پیغمبر! آپ کی طرف پروردگار کے پاس سے جو نازل کیا گیا ہے اسے (لوگوں تک) پہنچا دیجئے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا''۔

نبی کریمؐ ایک داعی انقلاب کی حیثیت سے اس دنیا میں تشریف لائے اور آپ نے ۲۳ سال کے مختصر عرصہ میں خدا تعالیٰ کے عطا کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنی الہی دعوت کے ذریعہ انقلاب برپا کر دیا، آپ نے وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الاَقْرَبِیْنَ (شعراء:۲۱۴)''اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو خبردار کر دو'' سے کام شروع کیا، مرحلہ وار آگے بڑھتے رہے، تا آنکہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ (حجر:۹۴)''اب تمہیں جو حکم دیا جا رہا ہے اس کو با نگ دہل بیان کرو، اور مشرکوں کی پرواہ مت کرو'' کا حکم ہوا، لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْراً (فرقان:۱)''تا کہ اللہ کا بندہ (نبی آخر الزماں) ساری دنیا اور سارے طبقات انسانی (اور اجنہ) کو خبردار کر دے'' کو آپ کا مقصد بعثت قرار دیا گیا، اور دنیا نے پھر وہ منظر دیکھا جس کی عکاسی قرآن مجید نے یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا (نصر:۲)''لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں'' سے کی ہے، آنحضرت ﷺ کو جو کام سونپا گیا تھا آپ نے اس کو بخوبی تکمیل تک پہنچایا، حتی کہ قرآن مجید نے خود اس پر مہر لگا دی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ:۳)''آج میں نے تمہاری خاطر تمہارا دین مکمل کر دیا ہے، اور اپنے انعامات (اپنا واضح قانون دے کر) تم پر تمام کر دیئے ہیں، اور اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا ہے'' یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی، چنانچہ آپ نے اپنے آخری خطبہ میں فرمایا، اے اللہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا یا نہیں؟؟ اے لوگو کیا میں نے تم تک اللہ کا پیغام اچھی طرح پہنچا نہیں دیا؟؟ سنو کیا میں نے حق تبلیغ اچھی طرح ادا نہیں کر دیا؟؟ کیا میں نے حق تعلیم و تلقین دین کی انتہا نہیں کر دی؟؟ سارے حاضرین بیک آواز اقرار و اعتراف کرنے لگے، پھر آپؐ نے فرمایا کہ جو یہاں موجود ہیں وہ غیر موجود تک پیغام پہنچا دیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے تبلیغ کو سمجھا اس کے اصول متعین کیے، اس کے دائرہ کو وسعت عطا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے جزیرۃ العرب کو بت پرستی سے بالکل پاک کر دیا، خالق و مخلوق کے درمیان حائل پردوں کو چاک کر دیا، انسانوں کو متعدد نوع کی غلامی سے نکال کر ایک خدا کے در پر ڈال دیا، انسانی برادری میں مساوات کو عام کیا۔

بحیثیت مجموعی آنحضرت ﷺ نے اپنی انقلابی و دعوتی تحریک کے ذریعہ دنیائے انسانیت کی قسمت جگا دی، آپ نے تلاوت

کتاب کے ذریعہ لوگوں کو خالق کائنات سے آشنا کیا، ان کو علم کے فضائل بتائے اور ایسے معاشرے میں علم کو فروغ دیا جہاں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا، ان کو تمام تر ظاہری و باطنی آلائشوں سے پاک کیا دانائی و دانشمندی کی باتیں سکھائیں، اور تہذیب و تمدن کے گر سکھائے، آپ کو مبعوث ہی کیا گیا تھا اسی مشن کی تکمیل کے لئے، فرمایا گیا ہے هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ،(جمعہ:۲) ''وہی ہے جس نے امی قوم (ان پڑھ قوم) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث فرمایا جوان کے سامنے اللہ کے کلام کی آیتیں پڑھ کر سنا رہا ہے، اوران کا تزکیہ فرمارہا ہے اور انہیں الکتاب (قرآن مجید) کا علم دے رہا ہے، اور حکمت کی باتیں سکھا رہا ہے، اس سے پہلے وہ لوگ کھلی گمراہی میں تھے'' آپ کو نہ زور زبردستی کا حکم دیا گیا اور نہ نگراں اور داروغہ گیری کی ذمہ داری دی گئی بلکہ آپ کو صرف اور صرف بات پہنچانے (تبلیغ) یاددہانی کرانے (تذکیر) ڈرانے (انذار) خوشخبری سنانے (تبشیر) اور تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کی ذمہ داری سونپی گئی، سیرت کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے تلاوت کتاب اور جہاد بالقرآن سے کام کا آغاز کیا حتی کہ وہ وقت آن پہنچا جب دنیا نے اسلام کی عملی تصویر کا مشاہدہ کیا اور اس کی آغوش رحمت میں آکر نئی زندگی شروع کی۔

یہ ملحوظ رہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ انسانیت کے لیے نمونہ کامل اور اسوۂ حسنہ ہیں، دعوت آپ کی بعثت کا مقصد اصلی ہے، آپ کے تشریف لے جانے کے بعد یہی مشن اس امت کو بھی دیا گیا ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ (آل عمران:۱۱۰) ''تم بہترین امت ہو، تمام انسانوں کے لیے اس امت کو برپا کیا گیا ہے، تمہیں بھلائیوں کا حکم دینا ہے برائیوں سے روکنا ہے'' اور اس مشن کی تکمیل کا سب سے بنیادی اصول اخلاص وتوکل علی اللہ کے ساتھ مخلوق سے بے نیازی ہے، تمام انبیاء کی تحریک دعوت میں یہ عنصر مشترک ہے جس کو وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (انعام:۱۶۳) ''اور مجھے اسی کا حکم فرمایا گیا ہے اور میں (تمہارے درمیان) پہلا مسلمان ہوں (فرماں برداروں میں اولین ہوں)'' میں بیان کیا گیا ہے اور انسانی فطرت کے پیش نظر اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (شعراء:۱۰۹) ''اور میں اس کے لیے کوئی اجرت نہیں چاہتا، میری اجرت تو رب العالمین کے ذمہ ہے''۔

جب تک اسی جذبہ کے ساتھ نبی کریم کی سیرت کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم سے استفادہ کرتے ہوئے دعوت کی تحریک نہیں چھیڑی جائے گی، جزئی تبدیلیاں آتی رہیں گی، زندگی کے کسی شعبہ میں تو بیداری آجائے گی مگر اکثر شعبے پژمردگی کا شکار ہوں گے، واقعہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کی سیرت نظروں سے اوجھل ہے، دعویٰ الفت بھی ہے، اور الفت کے نعرے بھی بلند کیے جاتے ہیں لیکن محبوبؐ کی سیرت سے روشنی حاصل نہیں کی جاتی، کیا صرف نعرہ الفت سے اقبال مند ہوجانا ممکن ہے، مسلمانوں کے دور اقبال اور عہد عروج کا راز سیرت طیبہ سے عملی رہنمائی حاصل کرنے میں مضمر ہے، آج اگر ہمیں امت کی فلاح اور دعوت وتبلیغ

کی کامیابی مطلوب ہے تو سیرت رسول کو عملی زندگی کا حصہ بنانا ہوگا، اس کے کمال و جامعیت، اس کی آفاقیت و ہمہ گیری سے روشنی حاصل کرنی ہوگی اور اس کے مطابق سفر طے کرنا ہوگا، پھر ہمارے سامنے مشن اس طرح ہوگا جس طرح نبی اکرمؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے سامنے برملا اعلان کیا تھا: ''چچا! خدا کی قسم اگر وہ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں اور یہ چاہیں کہ میں اس کو چھوڑ دوں، تو میں اس سے باز نہ آؤں گا یہاں تک اللہ تعالیٰ اس کو غالب کرے یا میں اس راستہ میں کام آجاؤں''، آپؐ کے بعد آپؐ کے تربیت یافتہ صحابہ نے اس مشن کو سمجھا تھا، انہوں نے ترجیحات پر عمل کرنا سیکھا تھا، تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کی جامعیت ان کے پیش نظر تھی، دین کا کامل تصور جو نبی نے دیا تھا اسی کے وہ مبلغ تھے، نتیجہ تو دیکھیے کہ نبی نے مشن کو جہاں چھوڑا تھا وہ اسے لے کر آگے بڑھتے ہی چلے گئے، حالات کا تجزیہ کرتے گئے، ترجیحات کو پرکھتے گئے اور عمل کرتے رہے، کوئی حارج ومانع ان کی راہ نہ روک سکا، حتی کہ ارتداد کی لہر اٹھی تو صدیق اکبر کے اس عزم مصمم أینقص الدین و أنا حي کی طاقت سے سہم کر ظلمات دریا میں غائب ہوگئی۔

موجودہ عہد میں بہت سی تنظیمیں ہیں، تحریکات وجماعتیں ہیں، سب کا دعویٰ تبلیغ دین ہے اور سب اپنے نظریہ کے اعتبار سے خدمت دین اور پیغام اسلام کی تبلیغ میں مشغول ہیں، راقم کو کبھی کبھی سب کے درمیان عدم تعاون کا احساس ہوتا ہے، نظریہ اور طریقۂ دعوت میں کچھ نقص وحرج نظر آتا ہے، تحریکات میں دین کے جامع تصور کا فقدان نظر آتا ہے، کبھی کبھی آیات و احادیث کی بے ربط توجیہات ہوتی ہیں، غلط مطالب بیان کئے جاتے ہیں، جزئی محنت کے سبب مکمل دین نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور صرف وہی جز زندگی کا محور بن جاتا ہے، اسی بنا پر متعدد تحریکات وجماعتوں سے وابستہ اور ان کے تربیت یافتہ افراد میں ایک طرح کے ''مذہبی وگروہی تعصب'' کا مشاہدہ ہوتا ہے، بسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کہیں صرف عبادات پر زور ہے، کہیں صرف قوت وطاقت کی باتیں ہیں، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ نبیؐ کی دعوت میں اخلاقی نظام بھی تھا، فضائل ومسائل کی تعلیم بھی تھی، عبادات ومعاملات کی تلقین بھی تھی، حکومت وسیاست کا قضیہ بھی تھا، ایک دعوتی تحریک تھی جس کے بہت سارے اجزاء تھے، آپؐ نے مرحلہ وار مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک اور بعد از ہجرت تا وفات ایک کامل شریعت، کامل دین اور مکمل نظام حیات کی تلقین فرمائی اور جب آپ رخصت ہوئے تو ایک مکمل تحریک، مکمل نظام اور مکمل ونتیجہ خیز انقلاب کو چھوڑ کر گئے، راقم ان پہلوؤں پر اپنے اداریوں میں وقتا فوقتا گفتگو کرتا رہتا ہے، آج جبکہ مذکورہ بالا امور میں کچھ شدت آگئی ہے، نقص وغلو کی کیفیت میں اضافہ ہوگیا ہے، مدرسہ وخانقاہ میں، دین ودنیا میں، تعلیم وتزکیہ میں، علمیت وروحانیت میں، دین وسیاست میں جاہلانہ تفریق کی جارہی ہے، یہی نہیں بلکہ مسجد مسجد کو الگ کیا جارہا ہے، مسجد نبوی کا نمونہ ہوتے ہوئے بھی ہماری مسجدیں فضائل ومسائل کی بنیاد پر تقسیم ہورہی ہیں، قرآن وحدیث میں فرق کیا جارہا ہے، فضائل ومسائل کو الگ الگ کرکے دیکھا جارہا ہے، کتابوں کی بنیاد پر لوگ تقسیم ہورہے ہیں، شخصیات اور نظریات فرقہ بندی کا سبب بن رہے ہیں، ہر کسی کو اپنے منہج دعوت کے منزل من اللہ ہونے کا دعویٰ ہے، اس وقت یہ احساس شدید

ہوتا جارہا ہے، کہ دعوت اسلامی کو جزئیات کے خانوں میں تقسیم کردیا گیا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہیئے کہ ہر ایک اپنے منہج و طریقہ کار کے کتاب وسنت سے اقرب ہونے کا مدعی ہے اور پھر ہر ایک نے اپنے لیے جو اصول ونظریات خود مستنبط کئے ہیں ان ہی میں دعوت کو اس طرح قید کردیا گیا ہے کہ کامیابی کے اسباب بالکل مسدود نہیں تو بہت محدود ضرور ہوگئے ہیں، یہ تفریق اس قدر بڑھتی جارہی ہے کہ کوئی علم ظاہر کا مدعی وعلمبردار ہے تو تزکیہ سے عاری اور کوئی تزکیہ کا داعی وخواہاں ہے تو علم شریعت سے کوسوں دور، بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ:

''......اور وہ مسجد نبوی جس میں یہ دونوں جلوے یکجا تھے، اس کی تجلیات مدرسوں اور خانقاہوں کے دو حصوں میں تقسیم ہوگئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس سے علمائے دین کی جگہ علمائے دنیا نکلنے لگے اور باطن کے مدعِ علم شریعت کے اسرار وکمالات سے جاہل ہوکر رہ گئے ......'' یہی نہیں بلکہ اب تو اس طرح کے بھی کئی گروہ پیدا ہوگئے جن کی زد پر مدارس بھی ہیں اور خانقاہیں بھی، جو نہ اس کو کافی سمجھتے اور نہ اُس کو، ان کی الگ ہی رَٹ اور دُھن ہے، آج ضرورت اس بات کی ہے کہ پھر سے کتاب اللہ اور سیرت وسنتِ رسول اللہ سے رشتہ استوار کیا جائے اور اس کی رشنی میں اسلام کے جامع نظام وپیغام کو سامنے رکھ کر دعوت کی محنت کی جائے، یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام میں دعوت ہی اصل اور مقصود اصلی ہے، حکومت مقصد اصلی نہیں، لیکن اسلام کو حکومت و اقتدار کی ضرورت ہے، اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے امر ونہی کے صیغے قرآن مجید میں استعمال کیے گئے جو خود اپنے اندر غلبہ واستعلا اور بلندی وعظمت کا مفہوم رکھتے ہیں، اقتدار وحکومت مقصود اصلی تو نہیں مگر یہ ضرورت جب پوری ہوجائے تو پھر اس کا طریقہ کار اور مقصد قرآن نے ضرور متعین کیا ہے، اس اقتدار کا مقصود شریعت اسلامیہ کا نفاذ، اسلام کی عادلانہ سیاست اور عدل وانصاف کا قیام ہے، ارشاد ربانی ہے! الذین إن مكناهم فی الأرض أقاموا الصلوٰة واٰتوا الزكاة وأمروا بالمعروف ونهو عن المنكر ولله عاقبة الأمور (حج ٤١) ''(حقیقی اہل ایمان وہ ہیں) جن کو جب ہم زمین میں اقتدار دیتے ہیں، وہ نمازیں قائم کرتے ہیں، اور زکوۃ دیتے ہیں، بھلائیوں کا حکم کرتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور تمام معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔

حقیقت یہ ہے کہ آج ہمارا رشتہ قرآن کریم سے منقطع ہوگیا ہے، دوسری بہت سی چیزوں کا چلن ہے مگر قرآن کا اس قدر چلن نہیں جو ہمارے عوام وخواص میں ہونا چاہیے تھا، حضرت شیخ الہندؒ نے مالٹا کی جیل میں بہت غور کیا تھا امت کی زبوں حالی پر، پھر یہ فیصلہ کیا تھا کہ امت کا رشتہ قرآن سے جوڑ دیا جائے اور اسی جذبہ سے انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ قرآن تروتازہ تھا اور ہے، آج بھی اس میں وہی تاثیر ہے جو کل تھی مگر افسوس کہ ہم اسے نہیں سمجھتے، سمجھنا بھی نہیں چاہتے بلکہ سمجھنے کی راہ میں بسا اوقات روڑا بھی بن جاتے ہیں، یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید کے دو مطالبے ہیں ایک تو "تفقه فی الدین" ہے، دین کا گہرا علم اور وسیع فہم ودراکی کا مطالبہ مگر یہ مطالبہ "منهم طائفة" ہر علاقہ اور ہر طبقہ کے کچھ لوگوں سے ہے، لیکن قرآن کا

دوسرا مطالبہ عام ہے اور دنیا کے تمام انسانوں سے ہے، ولقد یسرنا القراٰن للذکر فھل من مدکر" خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے قرآن مجید کو آسان بنا کر اتارا ہے کوئی ہے جو اس سے عبرت ونصیحت اور سبق حاصل کرے، قرآن میں تدبر وتعقل کی دعوت سب کو ہے مگر اس کے درجات ومراتب ہیں، ایک مجتہدانہ ذہن رکھنے والا جب تدبر کرے گا تو بے شمار مسائل کا استنباط کرے گا، ایک عام مولوی اگر تدبر کرے گا تو اس کے لیے مجتہدین کے فرمودات واجتہادات کا فہم حاصل کر لینا ہی کافی ہوگا، ایک عام پڑھے لکھے شخص کے لئے بس اتنی ضرورت ہے کہ معتبر ترجمہ قرآن کے ساتھ اس کتاب ہدایت کی تلاوت کرے اور مشکلات پیش آئیں تو علماء سے رجوع کرے، دوسرے مطالبہ کا مقصد یہی ہے اور یہ اس لئے بھی ہے کہ قرآن مجید کا ایک حصہ ایسا ہے جس کی فہم علماء سے رجوع کئے بغیر ممکن نہیں؛ لیکن ایک بڑا حصہ وہ ہے جس میں اللہ نے اپنے بندوں سے خطاب کیا ہے، ان کو خوش خبریاں سنائی ہیں، نعمتوں کا ذکر کر کے شوق دلایا ہے، جہنم کے عذاب سے ڈرایا ہے، انبیاء اور ان سے بغاوت کرنے والوں کے انجام کو بیان کیا ہے، یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ کتاب "ھدی للناس" ہے لوگوں کی ہدایت کے لئے اتاری گئی ہے، اور جس پر اتاری گئی ہے وہ "رحمۃ للعالمین" ہے، اس کی آفاقیت وعالمگیریت بھی مسلم ہے، اس کا منصب ہے لیکون للعالمین نذیرا وہ ساری دنیا کے انسانوں کو ڈرانے کے لئے آیا ہے، اس لئے جو امت آپ کے پیغام کی حامل وامین ہے اس پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے اتاری جانے والی اس کتاب ہدایت سے روشنی حاصل کرے اور سب سے پہلے ''لوگوں'' کی وسعت کو سمجھے، پھر اس کے آفاقی پیغام کو عام کرے اور اس یقین کے ساتھ عام کرے کہ یہی کتاب ظاہر وباطن کی معالج ہے، اسی کے قانون کی بالادستی سے دنیا میں امن وسکون کی فضا قائم ہو سکتی ہے، اسی کے نظام کے نفاذ سے صالح وپر امن معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے اور اسی کے منہج اصلاح وتربیت سے ایسے افراد کی تشکیل وتربیت ممکن ہے جو پیغمبرانہ کام وپیام کے حامل بن کر پوری دنیا میں اس پیغام کو عام کر سکیں، جب یہ امت لوگوں کے لئے برپا کی گئی ہے تو پھر ''دعوتی مشن'' کو نظریاتی قید وبند کی بیڑیوں سے نکال کر ہر فرد بشر تک پہنچانا اور اس یقین کے ساتھ پہنچانا اس کی ذمہ داری ہے کہ ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (توبہ ۳۳) ''اس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین برحق دے کر اسی لئے بھیجا ہے کہ ان کے دین کو تمام ادیان پر غالب فرما دے چاہے مشرکوں کو یہ کیسا ہی برا لگے''۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

□ پیام سیرت

قرب جاناں کی تڑپ

محمد فرید حبیب ندوی
Mob. 9012621589

''میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں...... لیکن کل آپ جنت کے اعلیٰ درجہ میں ہوں گے اور میں نچلے میں...... تو آپ کی زیارت کیسے ہوگی''

یہ کہہ کر وہ دیوانہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اشکوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ...... اور نہ رکنے والی ہچکیاں۔

چہرہ افسردہ وغمزدہ...... اور رخسار پہ اشکوں کا سیل رواں۔

وہ اسے بہت چاہتا تھا...... اپنے بیوی بچوں...... اور خود اپنی جان سے بھی زیادہ...... اس کی محبت اس کی رگوں میں خون کی طرح گردش کرتی تھی...... بلکہ خون سے بھی تیزتر۔

اس کی محبت کا نشہ بڑا عجیب تھا...... اس میں بے قراری تھی...... بے چینی تھی...... اضطراب تھا...... تڑپ تھی...... درد تھا...... کسک تھی...... لیکن اسی میں اس کی تسکین تھی...... یہی اس کی لذت...... اور...... یہی اس کی زندگی تھی......

کبھی محبت مچلتی...... تو پورا جسم مچلنے لگتا...... دل میں میٹھا سا درد اٹھتا...... اور آنکھوں سے دو قطرے پانی ٹپک پڑتا......

آہ!! وہ دو قطرے!!!...... جو آتش محبت کو کچھ کم کرنے کے لئے بہتے...... مگر ہائے رے محبت...... جو دو قطروں سے بجھنے کی بجائے اور شعلۂ جوالہ بن جاتی۔

وہ اس کا دیوانہ تھا...... چوری چوری اسے دیکھتا رہتا...... اس کی دید میں مٹھاس تھی...... چاشنی تھی...... مزہ تھا...... لذت تھی۔

وہ اس کا عاشق تھا...... یہ عشق اس کا سرمایہ تھا...... کتنا پاگل تھا وہ!!...... اپنے بیوی بچوں میں ہوتا...... دل ذرا چٹکی لیتا تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر...... اس کے دیدار کو دوڑ پڑتا...... اور جب تک اس کے رخ زیبا پر نگاہ پڑ نہ جاتی...... آتش محبت بھڑکتی رہتی...... بے کلی بڑھتی رہتی۔

اس کی ایک نگاہِ کرم اس کے لئے کسی ابرِ کرم سے کم نہ تھی۔

آج ایک عجیب سا خیال اس کے ذہن میں آیا...... اور وہ اسے سوچ کر بے چین ہوگیا...... دل کا درد آنکھوں کے راستے رخساروں پر بہہ گیا...... مگر...... کسک اٹھتی ہی رہی...... تڑپ بڑھتی ہی رہی...... اس نے دل کو سمجھانے کی بہت کوشش کی...... مگر اس نے سمجھ کے نہ دیا...... اور یہ پاگل دل مانتا ہی کب ہے...... ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ...... اسی سے درد کا درماں...... اور زخم کا مرہم دریافت کیا جائے......

وہ دوڑا دوڑا اس کے پاس گیا...... لیکن...... زبان گنگ ہوگئی...... یہ عجیب سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی...... وہ خود اپنے پاگل پن پر ہنسنے لگا۔

''کیا بات...... یہ بے اضطرابی اور افسردگی کیسی؟''

اسے خاموش...... اور چہرہ پژمردہ دیکھ کر محبوب نے خود ہی سوال کرلیا۔

''جی...... وہ...... میں...... آپ سے بہت محبت کرتا ہوں...... اپنی بیوی...... اپنے بچوں سے بڑھ کر اور خود اپنی

جان سے بھی زیادہ......محبت کرتا ہوں......آپ کے دیدار کو جی چاہتا ہے تو دوڑا آتا ہوں......شوقِ دید آپ کی مجلس میں کھینچ لاتا ہے...... زیارت ہوجاتی ہے...... پیاس بجھ جاتی ہے...... دل کو تسکین مل جاتی ہے......مگر......کل جنت میں آپ انبیاء کے ساتھ بہت اوپر ہوں گے...... مجھے اگر جنت ملی بھی......تو آپ سے بہت نیچے کا درجہ ہوگا...... وہاں آپ کا دیدار کیسے ہوگا؟...... اور جب دیدار نہ ہوگا......تو مجھے چین کیسے ملے گا...... یہ سوچ کر ہی میں پریشان ہوں......''

دل کی بات اس نے سامنے رکھ ہی دی۔

دل کا درد زبان پر آ ہی گیا۔

اب وہ جواب کا منتظر تھا ......اور جیسے ہی اسے جواب ملا ......خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا ......دل کی مراد بر آئی ...... خوشی کے مارے آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے ......اس کی خوشی دیدنی تھی ...... یہ جواب سنا تو اس کے مضطرب دل کو قرار آیا ...... بے چین روح کو تسکین ملی ......آقا ﷺ نے اسے جنت میں اپنی رفاقت کا مژدہ سنایا تھا......اور یہ عام اعلان فرمایا تھا کہ ''جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا، تو وہ ان کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ اور یہ بہترین رفیق ہیں''۔

آپ جانتے ہیں یہ دیوانہ کون تھا؟

یہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ تھے......جو آپ ﷺ سے بے پناہ محبت کرتے تھے......خلوت وجلوت اور سفر وحضر میں آپ کے ساتھ رہتے ......وہ غلام تھے......آپ ﷺ نے انہیں خرید کر آزاد فرما دیا تھا......اور فرمایا تھا کہ چاہو تو اپنے گھر والوں کے ساتھ رہو...... اور چاہو تو میرے ساتھ...... میرے ساتھ رہو گے تو اہل بیت میں شمار ہوگا...... وہ دنیا جہاں سے بے پروا ہو کر آپ ہی کے ہو رہے......انہیں اپنے غلام محمد ہونے پر بڑا ناز تھا......زندگی بھر اس نسبت پر ناز کرتے رہے۔

ایک طرف صحابہ کا یہ حال دیکھئے کہ وہ جنت میں جا کر بھی زیارت محبوب کے لئے بے چین ہیں......قرب جاناں کی تڑپ نے انہیں تڑپا رکھا ہے...... دوسری طرف اپنا محاسبہ کریئے:

کیا ہمارے دل میں بھی اس طرح کی کوئی تڑپ ہے؟

کیا ہمیں بھی کبھی زیارت محبوب کا شوق اٹھتا ہے؟؟

کیا ہمارے سینہ میں بھی قرب جاناں کی تڑپ انگڑائی لیتی ہے؟؟؟

ہم تو دنیا میں اس طرح مگن ہیں کہ کبھی اس کی رفاقت وہم نشینی کے لئے ہمارے دل میں کوئی درد ہی نہیں اٹھتا۔

آخرت کا تو خیال ہی نہیں آتا......اور اگر آتا بھی ہے تو بس جنت و دوزخ کے حوالے سے......اس پہلو سے کہ ہمیں بھی آپ ﷺ کی رفاقت نصیب ہو......کبھی ہم آخرت کو یاد بھی کرتے ہیں؟؟

ویسے ہم اس لائق ہیں بھی نہیں کہ آپ کا سامنا کر سکیں......لیکن کیا اگر ہم اس کے راستہ پر چلیں گے، تو وہ ہمیں اپنی رفاقت سے سرفراز نہ فرمائے گا؟...... ہمارا محبوب تو بڑا کریم ہے...... وہ تو اپنے گنہگار سے گنہگار امتی کو بے پناہ پیار کرتا ہے...... کیا وہ ہماری گستاخیوں سے درگذر نہ کرے گا؟؟......کیا وہ ہمیں اپنے سینہ سے نہ لگائے گا؟؟

کیا وقت نہیں آیا کہ ہم توبہ کریں......تجدید وفا کریں...... اور حب رسول میں فنا ہو جائیں؟؟

ابھی وقت ہے......سمجھنے کا......کچھ کرنے کا......اور جنت میں آپ کی ہم نشینی کو پانے کا......ٹکٹ بٹ رہے ہیں......محبت نامے تقسیم ہو رہے ہیں......کوئی ہے جو آگے بڑھے اور...... منادی کی پکار پر لبیک کہے؟؟...... ہے کوئی؟؟۔

☆☆☆

❑ نقطۂ نظر

چمن سرور کا جل گیا

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

۱۱ مارچ ۲۰۱۷ کی شام کو سراج اورنگ آبادی کا یہ مصرعہ بہت یاد آیا ''چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا''، چمن میں بادِ صرصر چلی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زندہ قومیں مسائل اور مشکلات سے دوچار ہوتی ہیں، اور انہی سے ان کی قوت اور زندگی کا اظہار ہوتا ہے، انہی سے ان کے اندر مدافعانہ قوت کی نشو ونما ہوتی ہے، جو لوگ سخت سردی یا سخت گرمی کے موسم میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کی جسمانی قوت مدافعت زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ افراد کی طرح قومیں بھی مخالفت کی آندھیوں کے درمیان رہ کر خود کو زیادہ طاقتور اور ناقابل تسخیر اور حوصلوں سے معمور بنالیتی ہیں، ان کے لئے سخت اور جاں گسل حالات قدرت کی طرف سے انعام ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اور صحابہ کرام نے مکی دور میں بہت سی پریشانیاں برداشت کیں، لیکن مشکلات کے خار دار صحرا میں وہ ثابت قدم رہے، یہی نصیحت اقبال نے کی ہے

کانپتا ہے دل ترا اندیشہ طوفاں سے کیا
نا خدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو

ہمیں خود احتسابی کی شدید ضرورت ہے، ہم نے ہمالیہ پہاڑ کے برابر غلطیاں کی ہیں، یوپی کے الیکشن میں مسلمانوں کے ووٹ بری طرح تقسیم ہوگئے، سیاسی پارٹیوں کے درمیان اور پھر ایک مسلم پارٹی کے درمیان جس نے مسلمانوں کے پاکٹ میں اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے، جب مسلم قائدین صحیح رہنمائی سے قاصر ہوں اور جب مسلمانوں میں اتنا بھی اتحاد نہیں ہو کہ وہ سب مل کر اور اصابت رائے سے ووٹ دینے کا صحیح فیصلہ کرسکیں تو اس کا نتیجہ تو یہی ہونا تھا جو سامنے آیا، جہاں مسلمان تیس اور چالیس فی صد تھے، اس تفرقہ اور اختلاف کی وجہ سے وہاں بھی ان کا امیدوار جیت نہیں سکا کیونکہ ان کے ووٹ تقسیم ہوگئے تھے۔

تجربہ نے ثابت کیا ہے کہ مسلم قائدین میں بصیرت اور اخلاص کی کمی بھی پائی جاتی ہے، ان کا کردار بھی بلند نہیں ہے، بڑے بڑے اداروں مدرسوں اور تنظیموں میں اختلافات اور ٹوٹ پھوٹ کے واقعات جو پیش آتے ہیں وہ اسی سبب سے پیش آتے ہیں کہ اوپر کی قیادت کی صف میں کچھ لوگوں میں اخلاص ختم ہوجاتا ہے اور ان کا کردار داغدار ہوجاتا ہے اور اس کی وجہ سے حفاظت کا شامیانہ اٹھالیا جاتا ہے، ابلیسی قوتیں اپنا کام کرنے لگتی ہیں، بظاہر دیکھنے میں یہ لگتا ہے کہ فلاں شخص کے فلاں کام کی وجہ سے یہ برا وقت آیا ہے اور ادارہ کو نقصان پہونچا ہے اور پھر ایک دوسرے پر الزام اور اتہام کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ہم قیادت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ایسے اشخاص ملتے ہیں جن کے یہاں عہدوں کی ہوس اور جاہ ومال کی طلب موجود ہے، جن کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ امراض ہیں جو خواص کو لاحق ہوچکے ہیں، ان عیوب کا خمیازہ پوری امت کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ عیوب اللہ کے یہاں ناپسندیدہ ہیں۔ اور ان عیوب کی وجہ سے پوری امت آسمانی حفاظت کی چھتری سے محروم ہوجاتی ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جن کی اصلاح نہیں ہوئی

تو ملت کی کشتی خطرہ سے دوچار ہوسکتی ہے۔

یوپی کے الیکشن کے نتائج نے ملت اسلامیہ کے مستقبل کے بارے میں اندیشے پیدا کردئے ہیں۔ پرسنل لا کو ختم کرنے کا عہد تو بی جے پی کے منشور میں شامل ہے، ہندو تہذیب کے غلبہ کا وہ عہد کرچکی ہے، وہ وقت قریب ہے کہ راجیہ سبھا میں اس کی اکثریت ہوجائے اور اس کے بعد قانون اور دستور کو بدلنا اس کے لئے بہت آسان ہوجائے گا۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کی جاچکی ہے دہشت گردی کا ہوا کھڑا کیا گیا ہے، الیکشن کے نتائج اسی فضا کے آئینہ دار ہیں۔ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ امریکہ اور مغربی ممالک میں مسلمانوں کو شر پسند اور دہشت گرد اور سازشی سمجھانے لگا ہے، یہ ایک نظریہ ہے جو پروان چڑھ رہا ہے اور یہ سوچ ہر جگہ قبول عام اختیار کرہی ہے، یوپی کا الیکشن چشم کشا ہے، بہر حال اب تو جو ہونا تھا وہ ہوچکا، اب سب سے پہلے ہمیں اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اللہ تعالی مالک الملک ہے، تمام حکومتوں کا مالک وہی ہے، وہی جسے چاہتا ہے اقتدار عطا کرتا ہے اور اسے زمین کا وارث بناتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے اقتدار وحکومت چھین لیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے جسے چاہتا ہے رسوا کردیتا ہے، اسی کے ہاتھ میں خیر ہے، اقتدار کی کنجی اسی کے ہاتھ میں ہے، مسلمانوں کو اللہ سے خیر وعافیت طلب کرنا چاہئے، اور باطل کے سامنے سرنگوں ہونے سے ہر حال میں پرہیز کرنا چاہئے، یہ بات بھی ذہن نشین کرنی چاہیے کہ کشمکش اور کشاکش کی دنیا میں بقاء انفع کا قانون جاری ہے، قدرت بہتر کا انتخاب کرتی ہے تاکہ خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا کا انتظام درست ہو، اور جب حکمراں قوم اپنی اہلیت کھو دیتی ہے تو پھر وہ معزول کردی جاتی ہے، یہ جو سیاسی انقلابات آتے ہیں، اس میں اللہ تعالی کی پوشیدہ مصلحتیں ہوتی ہیں، اگر مسلمانوں کے اندر جوہر قابل پیدا ہوجائے، تو ممکن نہیں کہ انھیں عزت اور اقتدار سے سرفراز نہ کیا جائے، باضابطہ طریقہ سے ملک میں ہر سطح پر کوشش ہونی چاہئے کہ ہر مسلمان صالح بھی ہو اور صلاحیت والا یعنی تعلیم یافتہ بھی ہو، اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے کردار واخلاق کی خوشبو سے اسلام کا معطر اشتہار بن جائے۔

مسلمانوں کو بہت زیادہ خوف میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، صرف مثبت اور تعمیری کاموں میں مصروف ہونے کی ضرورت ہے، اگر مسلمان اپنی قومی زندگی کے اس خطرناک اور نازک موڑ پر یہ عہد کرلیں کہ وہ اپنے دین کے کسی جزء سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں، اور یہ عہد کرلیں کہ وہ حسن عمل اور کردار اور اخلاق میں ممتاز بنیں گے، اور اپنی تعلیمی پسماندگی کو دور کریں گے، اور اپنے وقت کو ضائع نہیں کریں گے، وہ برادران وطن سے اور خاص طور پر پسماندہ اور مظلوم طبقات سے مضبوط تعلقات قائم کریں گے۔ اپنے اندر نافعیت کی صفت پیدا کریں گے، دوسروں کیلئے خیر خواہ اور ہمدرد ثابت ہوں گے، اگر وہ اس ملک میں برادران وطن سے زیادہ فائق، ممتاز اور بااخلاق بن کر رہیں گے تو وہ اس ملک میں بوجھ نہیں ہوں گے، اور ان کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہوگا، تعلیم کے میدان میں پیش رفت سے اقتصادی حالات بہتر ہوں گے اور اقتصادی حالات کی بہتری سے تعلیم کے میدان میں پیش رفت ہوگی۔ یہ سمجھ لینا چاہئے جو قیادت مسلمانوں کو سنگھرش کے راستہ پر لے جانا چاہتی ہے وہ کم عقل اور غلط اندیش قیادت ہے، اس ملک میں مسلمانوں کو قرآن مجید نے راستہ بتایا ہے ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینك وبینه عداوة كانه ولی حمیم یعنی اے نبی برائی کو اس نیکی سے دفع کرو جو سب سے احسن ہو تب تم دیکھو گے کہ وہ شخص جس

سے تمہاری دشمنی ہے وہ تمہارا جگری دوست بن گیا۔

برادران وطن کے ساتھ اور بالخصوص پسماندہ طبقات کے ساتھ مسلمانوں کو گہرے تعلقات قائم کرنے کی ضرورت ہے، مسلمانوں کو اپنے حسن عمل اور تقوی اور پرہیز گاری کے اعتبار سے دوسروں سے ممتاز بننا پڑے گا، اسلام پر اور مسلمانوں کی تہذیب اور عائلی قوانین پر جو اعتراضات ہیں اس کا بہت مدلل جواب تیار کرنا ہوگا، انگریزی اور مقامی زبانوں میں اس کے ترجمے کرنے ہوں گے، ان کتابوں کو جج اور وکلاء اور اہل فکر وعلم کے درمیان تقسیم کرنا ہوگا، اسلام کے تعارف کے کام کے ساتھ اور حسن اخلاق اور اعلی کردار کے ساتھ اچھی تعلیم برادران وطن کے دلوں کو مسلمانوں کا شیدائی بنا سکتی ہے، اس وقت مسلمان دلتوں سے بھی زیادہ پسماندہ ہیں، وہ جو کبھی شاہ زمن تھے اور خسروئے اقلیم وطن تھے وہ جاروب کشوں کے درجہ تک پہنچ گئے ہیں، سچر کمیٹی کی سفارشات اور رنگ ناتھ مشرا کمیٹی کی رپوٹ سب کے علم میں ہے، ہمیں کمزوریوں کا مداوا خود کرنا ہوگا، اور مسلمانوں کو اس کے لئے تیار کرنا ہوگا کہ وہ خود اسلام پر عمل کریں گے اور اپنے بچوں میں اسلامی غیرت اور حمیت پیدا کریں گے، خود روکھی سوکھی روٹی کھائیں گے، لیکن اپنی اولاد کی تعلیم سے غافل نہیں ہوں گے اور تعلیم میں ممتاز ہونے کے لئے وہ دوسروں سے زیادہ دوگنی محنت کریں گے۔ اور اپنا وقت ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ اور تعلیم کے میدان میں اپنا امتیاز قائم کریں گے۔ خدمت خلق کو اپنا شعار بنائیں گے، کیونکہ اسلام میں اس کی تاکید بہت ہے اور یہ دلوں کو فتح کرنے کا ذریعہ ہے، مسلمانوں کے ہر ادارے میں خدمت خلق کا شعبہ قائم ہونا چاہئے۔

ہمیں مستقبل میں ایسی نسل کی ضرورت ہے جو برادران وطن سے ان کی زبان میں ڈائلاگ کر سکے، مذہبی اور سماجی مسائل پر مکالمات کر سکے اور جو پورے اعتماد کے ساتھ ان سے ہم کلام ہو سکتی ہو، ہمیں ایسے سیکڑوں علماء کی ضرورت ہے جو برادران وطن کے مذہب سے ان کی تہذیب سے ان کی تاریخ سے اور ان کی نفسیات سے واقف ہوں، اس عظیم کام کے لئے برادران وطن کے مذہب اور ان کی تہذیب کا اور ان کی کتابوں کا عمیق مطالعہ ضروری ہے، ان کی زبانوں سے واقفیت ضروری ہے، اس کام کا شعور عیسائیوں کو ہے لیکن مسلمانوں کو نہیں ہے، عیسائی مسلمانوں میں کام کرنے کے لئے اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں، اس کیلئے ان کے ہاں شعبے قائم ہیں مسلمانوں کے دینی تعلیمی اداروں کو اس کام کی کوئی فکر نہیں ہے، اس اہم کام کا انتظام شروع سے دینی مدارس میں ہونا چاہئے، حیدرآباد سے دہلی تک اور دہلی سے سہارنپور تک اور یوپی سے گجرات تک مدارس کے ذمہ داروں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال رکھی ہیں اور اسلاف نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق جو نصاب بنایا تھا اب بدلے ہوئے حالات میں بھی انہیں اسی پر اصرار ہے اور وہ تبدیلی کے روادار نہیں۔ اگر ہم اب بھی نہیں جاگیں گے تو پھر جاگنے کے لئے ہم کو صور اسرافیل کا انتظار کرنا ہوگا۔

جب ۲۰۱۴ کے انتخابی نتائج سامنے آئے تھے اور حالات نے نیا رخ اختیار کر لیا تھا اس وقت بھی اس سے ملتی جلتی باتیں کہی گئی تھیں اور اس الیکشن کے بعد تو خطرہ تمام حدود کو پار کر گیا ہے، اب قانون اور دستور کو بدل کر صرف پرسنل لا اور بابری مسجد نہیں بلکہ عقیدہ کی فصیل پر بھی حملہ ہونے والا ہے، اب تو مسلمانوں میں حشر برپا ہو جانا چاہئے مردوں کو بھی کھڑا ہو جانا چاہئے، لیکن وہ قوم جس نے انکار وجحود کی تمام سنتیں ہمیشہ تازہ کی ہیں کیا اب وہ خطرہ عظیم کے بعد عقل کی بات سننے کے لئے تیار ہو سکتی ہے اور کیا مسلم قیادت اپنی اصلاح کے لئے تیار ہو سکتی ہے اور اپنی کمزوریوں کو سمجھ سکتی ہے اور رجوع الی اللہ پر آمادہ ہو سکتی ہے اور مستقبل کے لئے لائحہ عمل ترتیب دے سکتی ہے؟

☆☆☆

❑ شخصیات

ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

بحر علم کے شناور، میدان تحقیق کے شہسوار اور سادگی کے پیکر ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

(۱۹ فروری ۱۹۰۸ء - ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ء)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا نام نامی اپنی گونا گوں خصوصیات کے سبب تاریخ میں زندہ و تابندہ رہے گا، وہ ایک بلند پایہ محقق علم و تحقیق کے شناور اور عظیم سیرت نگار ہیں، ان کو اگر شاہراہ علم کا بے چین مسافر اور شہید تحقیق وجستجو کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں، ان کے علمی کارنامے انہیں صدی کا محقق اعظم بلکہ بقول ایک صاحب قلم، علم وتحقیق کا ''مجدد'' قرار دینے کے لیے کافی ہیں، انہوں نے کتاب اللہ کے نور ہدایت کو پھیلانے کا کارنامہ انجام دیا، عہد نبوی کے تمدنی جلووں پر خامہ فرسائی کی اور ایسے نکتوں کی طرف اشارہ کیا جن کی طرف عام طور پر سیرت نگاروں کے ذہن کی رسائی نہ ہوئی، عہد نبوی کے نظام زندگی کو تحقیقی انداز میں پیش کیا، سیرت نبوی کا منفرد زاویہ سے مطالعہ کیا، سیرت نگاری کو ایک نیا رخ دیا، سیرت نبوی کے بحر ذخار کی شناوری ان کا امتیاز بن گئی، قرآن وسیرت کی خدمت جلیلہ نے انھیں ایسا سورج بنا دیا جس کی روشنی سے ایک زمانہ مستفید ہوا، انہوں نے یورپ کے کلیساؤں میں اذان دینے کا فریضہ انجام دیا، وہ اپنے کردار وعمل اور اپنے علم وتحقیق کے باعث خاموش دعوت بن گئے، واقعہ یہ ہے کہ ان کی امیدیں قلیل تھیں مگر ان کے مقاصد جلیل تھے، وہ اسرار خودی کے رمز شناس تھے، جاں پر سوزی ان کی فطرت ثانیہ تھی، عہد حاضر میں انہوں نے قدیم محققین اور اہل قلوب کی یاد تازہ کر دی، واقعی وہ ایسے سورج تھے جس کے غروب ہو جانے کے بعد لمحہ بہ لمحہ اس کے طلوع جدید کا انتظار رہتا ہے، وہ یقیناً اس مشہور شعر کا مصداق ہیں ؎

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں، ملکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۱۶ محرم ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹ فروری ۱۹۰۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔(۱) ان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد کی ایک درسگاہ ''دارالعلوم'' میں ہوئی، وہاں کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ نظامیہ سے بھی کسب فیض کیا، عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کیا، وہیں سے دینیات میں ایم، اے کیا۔ دینیات میں ایم اے کرنے والے اس طالب نے ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی، اس کے بعد بون یونیورسٹی جرمن سے ڈی فل اور سوبون یونیورسٹی پیرس سے ۱۹۳۵ میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں، سربون یونیورسٹی پیرس میں بھی تدریس وتحقیق سے وابستہ رہے، ۱۹۴۸ء سے پیرس میں مقیم تھے، وہ تاعمر علم وتحقیق سے وابستہ رہے، وہ ہمیشہ ''اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا'' کا مصداق بنے رہے، ۱۹۹۶ء میں بیمار ہوئے تو اپنی بھتیجی کے ہمراہ امریکہ چلے گئے، ۱۷ دسمبر ۲۰۰۲ء کو سفر آخرت اختیار کیا، سرزمین ہند کا یہ لخت جگر سقوط حیدرآباد سے اس طرح روٹھا کہ پھر کبھی ہندستان نہ لوٹا، درحقیقت ڈاکٹر صاحب مرحوم نظام

حیدر آباد کی اس تجویز کے موید تھے کہ حیدر آباد ایک خود مختار وآزاد ریاست باقی ہے، مگر بدقسمتی سے یہ ممکن نہ ہوا اور ۱۹۴۸ کے پولیس ایکشن نے خرمن دکن پر جو بجلی گرائی اس سے عاشقان پاک طینت کی دل برداشتگی پر کوئی تعجب بھی نہیں۔ ۱۹۴۶ میں نظام نے اقوام متحدہ کے سامنے ریاست حیدر آباد کا موقف رکھنے کے لیے جو وفد تشکیل دیا تھا اس میں ڈاکٹر صاحب کو وفد کا صلاح کار بنایا تھا، اس سے قبل نظام کی طرف سے ایک قافلہ بذریعہ ٹرین حج کے لیے روانہ کیا گیا تھا اس میں بھی ڈاکٹر صاحب کو سالار قافلہ بنایا گیا تھا۔ (۲)

ڈاکٹر صاحب مرحوم بلند پایہ انسان تھے، ان کی شہرت وعظمت اور جلالت علمی کے باوجود ان کی سادگی کے ذکر نے ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور بلا قصد وارادہ زبان پر یہ شعر جاری ہو گیا ؎

سبھی انداز حسن پیارے ہیں
ہم مگر سادگی کے مارے ہیں

اس مضمون میں بس ان کی سادگی کا ہی ذکر کرنا مقصود ہے مگر اس سے پہلے ضروری ہے کہ ان کی علمی جلالت اور اہم مناصب سے ان کی وابستگی کا تذکرہ بھی کر دیا جائے، سادگی کا خاص تذکرہ اس لیے مقصود ہے کہ عام طور پر علمیت کے پردہ میں وہ دب جاتی ہے اور آج کی دنیا میں اس پہلو سے پہلوتہی بھی عام ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کردار وعمل اور زہد وتقوی ہی علم کی روح ہیں، اس کے بغیر علم بے جان ہے، تزکیہ تعلیم کتاب پر مقدم ہے، بدون تزکیہ تعلیم کتاب کا مقصد حاصل ہونا ممکن نہیں، سادگی، قناعت، توکل پارسائی سب تزکیہ کے مظاہر ہیں اور یہ مظاہر باطن کی درستگی کی علامت اور عالم کے باعمل ہونے کی دلیل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب چونکہ زندگی بھر علم وتحقیق سے وابستہ رہے اس لیے ان کے افادات کی فہرست تیار کرنا خود ایک ریسرچ کا موضوع ہے، ان کے شاگردوں کی فہرست بھی خاصی طویل ہے، یورپ وایشیاء میں پھیلے ہوئے بے شمار اصحاب تحقیق کے چراغ کی روشنی بالواسطہ یا بلا واسطہ ان ہی کی رہین منت ہے، ان کی علمی فتوحات کا احاطہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں مگر ان کی علمی جلالت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو دنیا کی کئی مشہور یونیورسٹیز استاد زائر (Visiting Professor) کی حیثیت سے مدعو کرتی تھیں، ۱۹۵۱ء میں استانبول میں مستشرقین کی عالمی کانفرنس میں فرنچ زبان میں اپنا مقالہ پیش کیا، جس کے نتیجہ میں آپ کو استاد زائر کی حیثیت سے استانبول یونیورسٹی میں مدعو کیا گیا ۱۹۵۲ سے ۱۹۷۸ء تک وہ ہر سال مارچ سے مئی تک استانبول یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ پر لکچر دینے کے لئے جاتے رہے، ڈاکٹر صاحب سے متعلق لکھنے والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ پندرہ سے زائد زبانوں پر عبور رکھتے تھے، سات زبانوں میں تو ان کی تصنیفات ہی ملتی ہیں، عربی، فارسی، ترکی، عبرانی، سریانی، لاطینی، یونانی، روسی، جرمنی، چینی، اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی پر انہیں دسترس حاصل تھی، وہ اپنی یادداشت میں متقدمین کی مثال تھے۔ (۳)

پاکستان وجود آنے کے بعد کسی اسلامی ملک کے بنیادی اصول مرتب کرنے کے لئے جن ارباب علم ودانش کو مدعو کیا گیا ان میں ڈاکٹر حمید اللہ کا نام نامی بھی شامل ہے، ۱۹۴۹ء میں کراچی میں تعلیمات اسلامیہ بورڈ کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد مجلس دستور ساز کی رہنمائی تھا، جس کے صدر علامہ سید سلیمان ندویؒ تھے، تو اس بورڈ میں بھی ڈاکٹر صاحب کا نام شامل تھا، ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۰ء ایک سال ڈاکٹر صاحب نے پاکستان میں قیام کر کے پیرس واپسی کی، لیکن ''اسلامی ریاست کے بنیادی اصول'' کے طور پر علماء ودانشوران کی ۳۱ رکنی کمیٹی

نے جو وثیقہ پیش کیا اس میں ڈاکٹر حمید اللہ کے مشورے شامل تھے اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب سے علامہ سید سلیمان ندویؒ مشورے کرتے رہتے تھے، ۱۹۵۴ سے ۱۹۷۴ء تک ڈاکٹر صاحب پیرس میں واقع سائنسی تحقیق کے قومی ادارہ سے وابستہ رہے، جو فرانس کا سب سے بڑا قومی ادارہ ہے، جس کا مقصد قیام تحقیقات کا فروغ اور تحقیقی کام کو فروغ دینے والوں کو وسائل فراہم کرنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی علمی فتوحات سے ہی ان کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، زمانہ طالب علمی سے ہی مضمون نگاری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، آگے چل کر یہ مضمون نگار عظیم مصنف وبلند پایہ محقق بنا، اردو دائرہ معارف اسلامیہ کو اپنے بیش قیمت مقالات سے زینت بخشی، نقوش کے ''رسول نمبر'' میں آپ کے وقیع مقالات بڑی اہمیت کے حامل ہیں، قرآنیات سے متعلق آپ کا کارنامہ عظیم الشان ہے، فرانسیسی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا، جس کے سبب ہزاروں سفید فام نور ہدایت سے مستفید ہوئے۔ ان کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے تین یورپی زبانوں میں کلام اللہ کا ترجمہ کیا، فرانسیسی کے بعد جرمن اور انگریزی میں بھی کلام الٰہی کو منتقل کرنے کی سعادت حاصل کی، البتہ جرمن اور انگریزی ترجمہ مکمل نہیں ہے بلکہ صرف چند سورتوں کا ترجمہ ہے، پروفیسر عبدالرحمٰن مومن کے مطابق ۲۰۱۶ء تک فرانسیسی ترجمہ کے بیس ایڈیشن نکل چکے ہیں اور آخری ایڈیشن ۲۰ لاکھ کی تعداد میں شائع ہوا ہے۔ (۴)

مختلف زبانوں میں قرآن کریم کے تراجم کا جائزہ لیا، ۱۹۴۴ میں ان کی کتاب "القرآن فی کل لسان" شائع ہوئی اس میں آپ نے قرآن کریم کے ۲۳ زبانوں میں تراجم کا ذکر کیا ہے اور بطور نمونہ ہر زبان میں سورہ فاتحہ کا ترجمہ نقل کیا ہے۔ حدیث میں آپ نے نہایت اہم خدمت انجام دی، ''صحیفہ ہمام بن منبہ'' کی تحقیق وتعلیق واشاعت تاریخ علم حدیث میں ایک زریں کارنامہ کی حیثیت رکھتا ہے، یوں تو ڈاکٹر حمید اللہ کی تصنیفات اسلامی قانون، اسلامی ریاست، اسلامی تاریخ اور علم آثار وکتبات، لسانیات اور دیگر متفرق موضوعات پر ہیں، انہوں نے ۶۰ سالہ مدت میں ۷ زبانوں میں ۱۶۴ کتابیں تصنیف کی ہیں، اور کم وبیش ایک ہزار تحقیقی مضامین ومقالات لکھے ہیں، ساری تصنیفات اور سب مقالات اگر یکجا کیے جائیں تو کوئی ۲۵-۳۰ ہزار صفحات ہوں گے، واقعہ یہ ہے کہ شاید ہی اسلامی تاریخ میں کوئی عالم ہو جس نے اتنے متنوع موضوعات پر مختلف زبانوں میں اتنا وقیع علمی سرمایہ چھوڑا ہو۔ لیکن ان کی شہرت ایک عظیم سیرت نگار اور فن سیرت کے ماہر محقق کی ہے، تحقیق ودریافت سے گویا انہیں شغف تھا، ان کی اسی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ایک ہی کتاب نے انہیں بین الاقوامی شہرت عطا کردی، ۱۹۴۱ میں پہلی مرتبہ جب ''الوثائق السیاسیۃ'' مصر سے شائع ہوئی تو دنیائے علم میں اس کی زبردست پذیرائی ہوئی، اہل علم نے حیرت واستعجاب کے ساتھ اس تحقیق کا استقبال کیا، اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے عہد نبوی اور دور صحابہ کی تین سو دستاویزات کو جمع کیا ہے، فرامین نبوی سے متعلق ایک اور اہم کتاب فرانسیسی زبان میں تصنیف کی، سیرت نبوی پر ایک اور تصنیف ۲ جلدوں میں فرانسیسی میں لکھی، جس کا ترکی اور یوگوسلاویہ کی بشناق زبان میں ترجمہ ہوا اس کا اردو ترجمہ بھی محمد رسول اللہ کے نام سے شائع ہوا، سیرت ابن اسحاق کی تحقیق وتعلیق اور اشاعت اسی طرح واقدی کی مشہور تصنیف کتاب الردہ کی تحقیق وتعلیق اور اشاعت آپ کا زریں کارنامہ ہے، عہد نبوی کے میدان جنگ ڈاکٹر حمید اللہ کی اچھوتی تصنیف ہے، عہد نبوی کا معاشرہ اور عہد نبوی میں نظام حکمرانی اور حضور اکرم کی سیاسی زندگی جیسی

تصنیفات ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ذوق سیرت اور فکری رجحان کا تعین کرتی ہیں، ان کے خطبات کا مجموعہ ''خطبات بہاولپور'' اگر ایک طرف ان کے مطالعہ کا نچوڑ ہے تو دوسری طرف ان کے دل دردمند کا عکاس ہے، وہ سیرت کو دینی شعور کی بیداری کا سب سے اہم ذریعہ سمجھتے تھے، وہ سیرت کو پیام زندگی سمجھتے تھے، وہ جانتے تھے کہ اگر صرف خرق عادت واقعات ومعجزات کو موضوع بحث بنایا جائے اور صرف اس ناحیہ سے سیرت کو پیش کیا جائے تو یہ قرآن کریم کے اسوۂ حسنہ کی تشریح نہ ہوسکے گی، خارق عادت واقعات عالم اسباب میں اسوہ حسنہ کی تشریح نہیں کر سکتے، ڈاکٹر صاحب کو اس کا ادراک تھا کہ مشرکین رسول کی بشریت پر ہی معترض ہوا کرتے تھے، وقالوا مال هذا الرسول ياكل الطعام ويمشي في الأسواق، لولا أنزل عليه ملك فيكون معه نذيرا (فرقان:۷) ''اور یہ کافر یوں کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ (ہماری طرح) کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہ بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ رہ کر لوگوں کو ڈراتا''، مطلب یہ کہ کفار یہ سمجھتے تھے کہ رسول و نبی فرشتہ کو ہونا چاہیے جو انتظام معاش اور کھانے پینے کی ضروریات سے مستغنی ہو، ورنہ کم از کم رسول کا مصاحب ومشیر کوئی فرشتہ ضرور ہونا چاہیے، اگر بالفرض ایسا ہو جاتا تو پھر یہی لوگ یہ کہتے کہ فرشتہ اور انسان میں کیا موازنہ، انسان کو تو بہت سے بشری تقاضے لاحق رہتے ہیں، فرشتہ انسان کے لیے نمونہ کیوں کر ہوسکتا ہے، اس لیے قرآن مجید نے اس اعتراض کا جواب دیا وما ارسلنا قبلك من المرسلين إلا إنهم ليأكلون الطعام ويمشون في الأسواق وجعلنا بعضكم لبعض فتنة أتصبرون كان ربك بصيرا (فرقان:۲۰) اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے، ہم نے تم میں سے ایک کو دوسرے کے لیے آزمائش بنایا ہے، کیا تم اب صبر کروگے اور آپ کا رب خوب دیکھ رہا ہے''۔

وہ کہا کرتے تھے کہ یہ کیسے رسول ہیں جو ہماری طرح کھاتے پیتے اور بازار جاتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے اسی رسول اور پھر ان کے اولین کے ذریعہ روئے زمین پر دین کو مستحکم کردینے کی بشارت پوری کی ہے، وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم في الأرض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذي ارتضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم أمنا (نور:۵۵) ''اللہ نے ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں ضرور خلافت سے نوازے گا جس طرح ان سے پہلے (اہل حق) کو خلافت دی، اور ان کے دین کو جس کو ان کے لیے پسند فرمایا ہے اقتدار عطا کرے گا، اور ان کی خوف اور بدامنی (کی حالت) کو امن وسلامتی سے بدل دے گا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی علمی اور بیش بہا خدمات سیرت کے ذریعہ یہ ثابت کردیا ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیت برحق ہے، یہ نبوت محمدی اور خلافت خلفائے اربعہ کے برحق ہونے پر دلیل ہے جبکہ روافض اس کے منکر ہیں چونکہ وہ خلفائے راشدین کی خلافت کو ہی صحیح نہیں جانتے اس لیے یہ وعدہ کبھی پورا ہی نہیں ہوا، رافض کے نظریہ کے مطابق یہ وعدہ مہدی موعود کے ذریعہ پورا ہوگا، ظاہر ہے کہ یہ خیال مضحکہ خیز ہے اور انتہائی غیر علمی ہے، ڈاکٹر حمد اللہ نے جس طرح عہد نبوی کو موضوع بنایا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ جس نظام کے استحکام کی بشارت دی گئی وہ عہد نبوی میں مستحکم کردیا گیا، انہوں نے سیرت نبوی کے ان پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے جو

عالم اسباب کے مناسب اور انسانوں کے لیے قابل عمل ہوں، سیرت سے متعلق اوپر ان کی کچھ تصنیفات کے ناموں پر آپ کی نظر پڑی ہوگی، ذرا خطبات بہاولپور کے ۱۲ خطبات میں سے ان موضوعات پر نظر ڈالیے، عہد نبوی میں مملکت اور نظم ونسق، عہد نبوی میں نظام دفاع اور غزوات، عہد نبوی میں نظام تعلیم، عہد نبوی میں تشریع وعدلیہ، عہد نبوی میں نظام مالیہ اور تقویم، عہد نبوی میں تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ وغیرہ ان کے زاویۂ نگاہ کو متعین کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ علوم اسلامیہ کے غواص تھے، محققانہ اور مجتہدانہ ذہن کے حامل تھے، ان جیسے جلیل القدر عالم سے یہ امید رکھنا کہ وہ اصحاب علم کی ہر رائے کو آنکھ بند کر کے قبول کرلیں، یہ ممکن نہیں، متعدد مسائل میں انہوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے، ان کے متعدد تفردات ہیں، کچھ قابل گرفت ہیں تو کچھ محل نظر اور کچھ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان کے یہ تفردات ایسے نہیں جس سے ان کے علم وفضل اور تفقہ پر آنچ آئے یا ان کی علمی دیانت داری پر انگلی اٹھائی جائے، انہوں نے ساری کشتیاں جلا کر قرآن وسیرت کی جو خدمت انجام دی ہے وہ نادر المثال ہے، ان کے تفردات مجتہدانہ خطأ کی نوعیت کے ہیں، چونکہ ان کے اختلاف کی بنیاد بھی قرآن وسنت کی تعبیر اور صحابہ وتابعین کے آثار پر ہے، انہوں نے اپنی رائے کے مطابق قرآن وسنت سے شواہد پیش کیا ہے یہ الگ بات کی اشتہاد میں وہ خطا کر گئے ہوں، عصمت تو صرف انبیاء کے لیے ہی خاص ہے باقی کسی انسان کی کوششوں کو معصوم نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ ہر مجتہد کی تمام آرا تمام لوگوں کے نزدیک قابل قبول ہوا کرتی ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ ان ہی لوگوں میں تھے جو لفظ لفظ کی تہہ میں اتر جاتے تھے، پھر استنباط کرتے تھے، قرآن وسیرت کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مجتہدانہ کوششیں کرتے تھے، اس راہ میں اگر علمی لغزشیں ہوئیں تو اس سے ان کی عظمت پر حرف نہیں آتا، یورپ کے کلیساؤں کو اذان اسلام کی معنویت سے آشنا کرنا ان کو وہ کارنامہ ہے جو ان کے تفردات پر بہت بھاری ہے، ان کی تحقیقات نے اسلام کا جس قدر دفاع کیا ہے اور جس طرح استشراق پر ضربیں لگائی ہیں وہ ان کا سرمایہ حیات اور توشۂ آخرت ہے، افسوس ہے کہ ہندستان کی مخصوص ذہنیت نے ان کو نہیں پہچانا اور نہ وطن عزیز نے ان کی وہ قدر کی جس کے وہ مستحق تھے۔

اوپر یہ بات آچکی ہے کہ ان کے بعض تفردات قابل مواخذہ اور بعض قابل قبول ہیں اور اکثر نا قابل قبول ہیں، ڈاکٹر صاحب کو عام طور پر ایک مفکر کی حیثیت سے نہیں پہچانا جاتا، لیکن ان کے بعض تفرات انہیں عظیم مفکرین کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں، انہوں نے اپنے خطبات میں ایک نظریہ پیش کیا جسے پروفیسر محسن عثانی خلافت اسلامیہ کے قیام کی جانب ایک قدم قرار دیتے ہیں، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کہتے ہیں:

''سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے تو ایسی حکومت اور مملکت قائم کر دی، لیکن آج کل کے حکمرانوں کی ذہنیت کو دیکھتے ہوئے کیا راستہ اختیار کیا جائے؟ اگر ان سب کو کہا جائے کہ ایک خلافت اسلامیہ قائم کرو جس کا ایک واحد حکمراں اعلیٰ ہو، تو وہ یہ منصوبہ قبول نہیں کریں گے۔ لہذا اب کیا کریں؟ میرے خیال میں ایک حل یہ ہے کہ تمام اسلامی دنیا مل کر سوئزرلینڈ کی طرز کا ایک نظام قائم کرے جس میں ہر علاقہ کا نمائندہ ہوتا ہے اور باری باری ہر ریاست کا نمائندہ پورے علاقہ کا حکمراں بنتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے چالیس پچاس ملک ہیں۔ اگر ایسا نظام کوئی مرتب کیا جائے کہ ہر ملک کا حکمراں نمائندوں کی

مجلس کا رکن ہوا اور باری باری ہر ملک کا حکمراں پورے عالم اسلام کا حکمراں بنے تو اس طرح اسلامی ملکوں میں اتحاد قائم ہو سکتا ہے۔ یہ نظام سب کے لیے قابل قبول ہونا چاہیے، کیوں کہ باری باری سب کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا'' (۵)۔

بظاہر یہ تجویز بڑی اہم ہے اور ایسی تجویز پیش کرنے میں وہ منفرد ہیں، ان کے سامنے چونکہ قرآن آئینہ کی طرح کھلا ہوا تھا، سیرت وسنت ان کے قلب ودماغ پر منقش ہو چکی تھی، اس لیے یہ بعید نہیں کہ وہ شاہ ولی اللہ کے اس نظریہ سے متفق ہوں کہ ارکان اسلام اور جہاد اور اس کے متعلقات کے لیے ایک اسلامی ریاست کا وجود ضروری ہے، اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ شاہ صاحب سے بہت متاثر تھے، (۶) بعض بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ کا فرنچ ترجمہ شروع کیا تھا مگر معلوم نہیں کس حد تک کر سکے، ڈاکٹر صاحب کی یہ تجویز اس لیے بھی بہت اہم ہے کہ خلافت اگر چہ اسلام کی منزل اور مقصد نہیں مگر اسلام کو ہر حال میں اس کی ضرورت ہے، تاریخ کا مطالعہ شاہد ہے کہ جب تک خلیفہ کا وجود باقی رہا خواہ اس کی کوئی بھی شکل رہی ہو تب تک اسلام کو عالم اسباب میں جو استحکام وعظمت حاصل رہی اس کی مثال اب نہیں ملتی، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کا ماتم بڑے بڑے مفکرین ودانشوران نے یوں ہی نہیں کہا علامہ شبلی اور علامہ اقبال نے جس طرح ترک ناداں کی نادانی کا ماتم کیا ہے اس سے خلافت عثمانیہ کے کمزور ہو جانے کے بعد بھی اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے،، ہندستان کے اکابر علماء نے تحریک خلافت یوں ہی نہیں چلائی، محمد علی جوہر کی والدہ محترمہ کے مومنانہ جذبات کا ترجمان یہ شعر یوں ہی زبان زد وخاص وعام نہ ہوا ؎

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اسی طرح عالم عربی کی موجودہ صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا ایک اور تفرد بہت اہم اور قابل عمل ہے، خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد طوائف الملوکی کا جو دور شروع ہوا اور جس طرح متعدد عربی خاندانوں میں چھوٹی چھوٹی جاگیریں تقسیم کی گئیں، پھر ان خاندانی حکومتوں نے عالم اسلام کو جس طرح مغرب کا غلام کیا، اسلامی تمدن اور اسلامی بالادستی اور اسلامی قوت کو جس طرح پامال کیا اس پر نظر ڈالیے، طویل مدتی خاندانی حکومتوں نے جس طرح واستبداد کا بازار گرم کیا اس کو ذہن میں رکھیے اور پھر ڈاکٹر صاحب کی اس رائے پر غور کیجئے:

''مسلمان فقہاء کے مطابق حکمراں یا خلیفہ کی حیثیت ایک وکیل کی ہے اور مؤکل جو کسی کو اپنا وکیل بناتا ہے اس بات کا ہمیشہ حق رکھتا ہے کہ وکیل کو معزول کر دے، جو لوگ کسی کو حکمراں بنائیں گے ان کو یہ حق بھی ہوگا کہ اس کو اس کی خدمت سے الگ کریں'' (۷)۔

اس تفرد پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

''واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات موجودہ دور کے اخلاقی حالات کے پس منظر میں بڑی ہی معقول معلوم ہوتی ہے اور توکیل کے مذکورہ اصول کی روشنی میں ایسا بھی ممکن ہے کہ امارت کو پانچ سال یا ایک مخصوص مدت کے لیے محدود کیا جائے، اگر ایسے امراء ہوں جن میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی للّٰہیت کا دس بیس فیصد حصہ بھی ہو تو اس کی حین حیات امارت کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے؛ لیکن موجودہ دینی واخلاقی انحطاط کے دور میں ایسے افراد کا ملنا اور ان کا منتخب ہونا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، ایسی صورت میں اگر زندگی بھر کے لئے اقتدار کی لگام کسی کے ہاتھ میں دے دی جائے تو وہ

فرعونِ بے سامان بن جاتا ہے، اس سلسلہ میں مسلم ممالک کا تجربہ ہمارے سامنے ہے، اس لئے مدت امارت کی تحدید ہونی چاہیے اور عوام کو اسے معزول کرنے کا حق ہونا چاہیے''(۸)۔

ڈاکٹر حمید اللہ علم وتحقیق کے جبل اعظم تھے مگر پھر بھی انہوں نے اپنے آپ کو محدود نہیں کیا، لوگوں سے ملنا جلنا، مزاج پرسی کرنا مشورے دینا اور تبلیغ دین کے لیے سعی کرنا ان کا خاص وصف تھا، ان کے علمی وتنوع، فکری وسعت، عمیق مطالعہ اور ادیان ومذاہب کے تقابل کے ساتھ دوسروں کے ساتھ ان کے تعامل، ذاتی زندگی میں سادگی نام ونمود سے احتراز کے علاوہ اسلام کی تبلیغ کے لیے وقت نکالنا اگر ایک طرف ان کے خلوص وللّٰہیت کی طرف اشارہ کرتا ہے تو دوسری طرف ان کی شخصیت میں جامعیت کے عنصر کی غمازی کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بچپن میں ہی یہ طے کرلیا تھا کہ وہ اپنی زندگی دین کے لیے وقف کر دیں تو انہوں نے ایسا کر کے دکھایا، قدیم وجدید کا مجمع البحرین بنے، پھر مشرق ومغرب کو منور کیا، ان کے فرنچ میں ترجمہ قرآنے کتنوں کو نور ہدایت سے آشنا کیا، فرنچ میں اسلام کے تعارف پر جو کتاب لکھی اس نے ہزاروں دلوں کو فتح کیا، ہزار ہا ہزار لوگ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر اسلام لائے، انھوں نے عام قارئین اور نومسلموں کے لیے اسلام کے تعارف کے طور پر جو کتاب Introduction to Islam لکھی اس کا ترجمہ ۲۲ زبانوں میں ہو چکا ہے، اس طرح کی ایک اور کتاب بھی انہوں نے تصنیف کی جس کا نام Islam a General Pichure(۹)، وہ مغرب میں رہے اور مغرب بیزار بھی نہیں رہے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ کبھی مغرب سے مرعوب بھی نہ ہوئے، ان کا رہن سہن، ان کی سادگی ان کی شخصیت اس کا ثبوت ہے کہ وہ اقبال کا یہ شعر نقش قلب رکھتے تھے:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ ونجف

انہوں نے اپنے آپ کو اس طرح علم کے لیے وقف کیا کہ علم کو ازدواج پر ترجیح دی، خود ڈاکٹر صاحب کا بیان ایک صاحب نے نقل کیا ہے، کہ ایسا انہوں نے عمداً نہیں کیا بلکہ پیرس کی تنہائی اور والدین سے محرومی کے علاوہ علم وتحقیق میں استغراق اس کا سبب بنا، ان کا استغراق ہی تو تھا کہ انہوں نے پیرس میں زندگی گزار دی مگر نہ کبھی وطن لوٹے اور نہ کبھی پیرس کی قومیت حاصل کی، پوری زندگی ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے گزار دی، پاکستان کے صدور کی طرف سے پاکستان میں مستقل قیام کی متعدد دعوتوں کو مسترد کر دیا، دو کمرے کے ایک فلیٹ میں ساری عمر گزار دی، جو چوتھی منزل پر واقع تھا، نہ کوئی ملازم رہا نہ کوئی خادم، خوردنوازی، مہمان نوازی اور کشادہ دلی ایسی کہ دنیا اس کی معترف، متعدد اصحاب قلم نے لکھا ہے کہ ان کی شخصیت میں استغنا اس طرح رچ بس گیا تھا کہ اسلاف کی یاد دلاتا تھا۔

ان کو جب شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، ان کے زہد وقناعت اور استغناء کا یہ عالم تھا کہ کبھی پھل وغیرہ پر قناعت کر لیتے کبھی آلو چاول خود بنا کر کھا لیتے، کھانا خود ہی پکاتے تھے، دنیا کی جنت اور اہل دنیا کے عشرت کدہ پیرس میں بسنے والا یورپ کا یہ باشندہ تقوی اور احتیاط کے اس مرتبہ پر فائز تھا کہ مشین کے ذبیحہ کو جائز نہ سمجھنے کے سبب گوشت کھانا چھوڑ دیا، جب یہ شبہ ہوا کہ پنیر میں بھی جانور کی آنتوں کی چربی استعمال ہوتی ہے تو اس سے بھی کنارہ کشی کر لی، یہ بھی قابل حیرت ہے کہ مغرب میں عمر بسر کرنے والا یہ شہید علم فوٹو کھنچانے کو جائز نہیں سمجھتا تھا تو زندگی پر اسی نقطہ نظر پر عمل پیرا رہا، ان کی قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ وہ نہ

کوئی انعام قبول کرتے تھے اور نہ کسی سے ہدیہ لیتے، پروفیسر عبدالرحمٰن کہتے ہیں: ''۱۹۹۴ء میں ڈاکٹر صاحب نے راقم السطور سے شخصاً بیان فرمایا تھا کہ ان کو جو رقم بطور پنشن ملتی تھی وہ پیرس کی ایک گھریلو ملازمہ کی تنخواہ سے بھی کم تھی'' (۱۰)، لیکن یہ استغنا کی چادر تھی جسے اوڑھ کر انہوں نے اپنی حیات مستعار کو زندۂ جاوید کر لیا، ان کی زندگی کا یہ عجیب واقعہ بھی سنیے، ان کے اراوت مندوں میں پیرس میں رہنے والے مراکش، الجیریا، ترکی اور دیگر مسلم ممالک کے بہت سے مسلمان تھے، ایک کردی بھی ان کا عقیدت مند تھا، جس سے ان کو بڑی ہمدردی تھی، پروفیسر عبدالرحمٰن کا کہنا ہے کہ ''ایک دفعہ دوران گفتگو ان کا ذکر آیا تو ڈاکٹر صاحب نے ہمدردی کے جذبات سے فرمایا کہ محمد کی چار بیٹیاں ہیں کوئی بیٹا نہیں ہے''____ آگے پروفیسر صاحب لکھتے ہیں ''ڈاکٹر صاحب کی نقاہت اور علالت کا فائدہ اٹھا کر محمد قر داغ نے ان کی چیک بک چرالی اور بینک سے ان کی تمام رقم نکال کر ہڑپ کر لی ڈاکٹر صاحب جب روپے نکالنے بینک پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے کھاتے میں کوئی رقم نہیں ہے'' (۱۱۔ سوچیے ذرا اس سن رسیدہ اور کمزور شخص کے دل پر کیا گزری ہوگی، نوبت یہ تھی کہ ان کے پاس کھانے کو بھی پیسے نہ تھے مگر غیرت، خودداری اور استغنا نے کسی سے کچھ کہنے نہ دیا، اسی عالم میں ایک روز بے ہوش ہو کر مسجد میں گر گئے، لوگوں نے ہسپتال پہنچایا، اسی علالت میں ان کی بھتیجی امریکہ سے آئیں اور پھر ۱۹۹۶ میں وہ امریکہ منتقل ہوئے۔

عین جوانی کے عالم میں جب وہ مجلس دستور ساز کی رہنمائی کرنے والے بورڈ میں شامل کیے گئے اور ایک سال آ کر پاکستان میں قیام کیا، اگرچہ ان حضرات کے قیام وطعام اور سفر کی ذمہ داری میاں خانوادے نے اپنے ذمہ لی تھی مگر ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے ایک عزیز کے یہاں قیام پسند کیا، جائے قیام سے بورڈ کا دفتر چار میل کے فاصلہ پر تھا مگر ڈاکٹر صاحب پیدل آیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب ایک محقق کی حیثیت سے چہار دانگ عالم میں شہرت رکھتے تھے، ان کے پاس دنیا بھر سے خطوط آیا کرتے تھے، ان کی زندگی میں بڑا نظم وضبط تھا، ناشتہ کے بعد کا وقت خطوط کا جواب دینے کے لیے خاص تھا، خطوط کا جواب دینے میں وہ تساہلی سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ خطوط کا جواب دینا ایسے ہی واجب ہے جیسے سلام کا جواب دینا، وہ روزانہ ۳۰ سے چالیس خطوط کا جواب دیتے تھے، آج ہمارے معاشرے میں ذرا جو کسی کو منصب حاصل ہوا تو اس سے خطوط کے جواب کی امید عنقا ہو جاتی ہے، اب تو زمانہ فون اور ای میل کا ہے مگر قربان جایئے کہ لوگ ہفتوں اور مہینوں میل کا جواب نہیں دیتے اور فون کرنے کے لیے بھی سوچنا پڑتا ہے، فون کیجیے بات ہو جائے تو سمجھیے نعمت عظمیٰ مل گئی اور اگر فون نہ اٹھے تو پھر کسی طرح کے استفسار وجواب کی امید نہ رکھیے خواہ آپ کا نمبر معروف ہو، اس کے برعکس یورپ میں اسلام کے اس نمائندے کا طرز عمل واقعی لائق تقلید وقابل تحسین ہے۔

ان کی انکساری و بے نفسی واقعی مثال ہے، ہمارے معاشرے میں اہل علم کا کبر ونخوت اور انانیت ورعونت بہت معروف ہے، ذرا جو تعارف ہوا تو اپنے بارے میں جانے کیا کیا گمان ہونے لگتا ہے، مگر علم وتحقیق کے اس کوہ ہمالہ کا حال یہ تھا کہ سلسلۂ نسب قریش سے ملنے کے باوجود کسی طرح کا احساس برتری نہیں، کسی طرح کی خاندانی وجاہت اور تعلّی کا اظہار نہیں، متعدد لوگوں نے ان کی سوانح لکھنے کی اجازت چاہی مگر انہوں نے کسی کو اجازت نہ دی، ان سے کسی رشتہ دار نے پوچھا کہ ہماری تاریخ کیا ہے، ہم لوگ کہاں سے آئے ہیں تو جواب دیا کہ تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں کہ ہم کہاں سے

آئے، فکر اس کی ہونی چاہیے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، ایک صحافی نے پوچھا کہ آپ اپنی علمی خدمات کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں تو جواب دیا کہ اگر خدا نے مجھ سے یہ پوچھ لیا کہ ہم نے جو علم تم کو دیا تھا اس کا کیا استعمال کیا تو میں کچھ جواب نہ دے سکوں گا۔ (۱۲)

یہ بات اوپر آ چکی ہے وہ ایوارڈ، انعام اور ہدایا قبول نہیں کرتے تھے، اگر کبھی کوئی رقم قبول کی تو وہ کسی ادارے کو دے دیتے، اس کے متعدد واقعات ہیں، ان کے استغناء کی آخری حد یہ ہے کہ انہوں نے کبھی اپنی مقبول زمانہ عالمی معیار کی تحقیقی کتابوں کی رائلٹی اور معاضہ پر توجہ نہ دی، وہ اگر چاہتے تو صرف اپنی تصنیفات سے کروڑوں کما لیتے مگر واقعی وہ دنیا سے ایک مسافر کی طرح گزر جانے کا عزم کر چکے تھے، ان کے فرنچ ترجمہ قرآن پر اس کے ناشر نے انہیں ایک مرتبہ ایک معقول رقم دی تو وہ بھی انہوں نے پیرس کی اسلامی انجمن کو عنایت کر دی (۱۳)، جس طرح یورپ اور یورپ کے شہر پیرس میں ایک عارفانہ وزاہدانہ زندگی گزارنا ان کا امتیاز ہے اسی طرح یہ بھی ان کی انفرادیت ہے کہ انہوں نے کبھی صلہ کی تمنا کی اور نہ ستائش کی آرزو، ان کی زندگی نام ونمود اور آرائش ونمائش سے بہت دور تھی۔

انہوں نے نری خلوت کو اپنا شعار بنایا، مگر حالات پر نظر رکھی، لوگوں سے تعلق رکھا، اسلام کا قلمی تعارف بھی کرایا اور کردار وعمل اور اعلیٰ اسلامی اخلاق سے بھی دعوتِ اسلام دیتے رہے، پیرس کی جامع مسجد میں ہر اتوار کو درس دیتے تھے، نوجوانوں کو کافی وقت دیتے تھے، فرانس کی مسلم دشمنی اور وہاں کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا انہیں ادارک تھا، لیکن اس پرخطر صورت حال کا انہوں نے پوری پامردی اور استقامت سے مقابلہ کیا، خود ان کے مطابق جس معاشرہ میں ایک پانچ سالہ مسلم بچہ کو گولی مار کر صرف اس لیے قتل کر دیا گیا ہو کہ اس نے پٹاخہ پھوڑ دیا تھا، اس معاشرہ میں اسلامی تشخص کے ساتھ جینا، اسلام کی تبلیغ کرنا ایمان واستقامت کی دلیل ہے، یہی نہیں بلکہ عیسائیوں کے چرچ میں بھی حق بیان کرنا ان کی للّٰہیت کی دلیل ہے، ایک مرتبہ ان کو اسلامی عقیدہ پر لکچر کے لیے چرچ میں مدعو کیا گیا، ان کا تعارف کراتے ہوئے صدر جلسہ نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ عیسائی تین خدا کو نہیں مانتے بلکہ وہ ایک ہی خدا کو مانتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں ثابت کیا کہ ''عیسائیوں کے یہاں توحید کا تصور ہونے کے باوجود اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے جو قابل قبول نہیں رہتا خود اپنی تردید کرتا ہے''۔ (۱۴)

ڈاکٹر حمید اللہ عزیمت پر عمل پیرا تھے، ان کے اندر حمیت وغیرت دینی پوری طرح موجود تھی، بعض لوگوں کا یہ کہنا درست نہیں کہ عالم اسلام میں مسلمانوں پر پیش آنے والے حالات سے ان کی رگ حمیت نہیں پھڑکتی تھی ان کا اندازہ شاید غلط ہو، یہ الگ بات کی طریقۂ اظہار الگ الگ ہوتا ہے، اہل کتاب کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال ہے، پیرس میں یہودیوں کی کافی آبادی ہے، لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کا یہ غیرت مندانہ فرمان سنیے کہتے ہیں کہ ''فرانس کے یہودی تاجر اور دوکاندار اسرائیل کے لیے چندہ بھیجتے ہیں جو فلسطینی عربوں پر ظلم کرتا ہے اور ان کا خون بہاتا ہے میں نہیں چاہتا کہ میرا مال بالواسطہ ایسی حکومت کے پاس پہنچے جو فلسطینیوں کا خون بہاتی ہے'' (۱۵)۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے نو سال کی عمر سے کبھی روزہ نہیں چھوڑا، مرض الموت میں بھی روزہ رکھنے پر اصرار کرتے تھے، عام طور پر وہ رمضان کے آخری عشرہ میں پیرس کی جامع مسجد میں قیام کرتے تھے، جب مدینہ جاتے تو تہجد کی نماز کے وقت حرم نبوی میں پہنچتے اور عشاء کے بعد وہاں سے واپس ہوتے، ڈاکٹر اکمل

الدین احسان اوغلو سے ہمارے عہد کے مثقفین واقف ہوں گے، (اوغلو OIC کے ڈائرکٹر جنرل رہ چکے ہیں) وہ ڈاکٹر صاحب کے تلامذہ میں تھے، ان کا تاثر یہ تھا کہ ڈاکٹر حمید اللہ اس زمانہ کے اولیاء اللہ میں ہیں، اس سے زیادہ حیرت انگیز اور کون سا واقعہ ہوگا کہ جب وہ بے ہوش ہوکر گرے اور انہیں اسپتال میں داخل کیا گیا تو ہوش آنے پر خاتون نرس کو جسم میں ہاتھ لگانے سے منع کر دیا اور اسپتال کے عملہ سے کہہ کر یہ فرائض انجام دینے والے مرد کو متعین کرایا، زہد وتقوی کی یہ شان اس قلندر کی تھی جس کی زندگی مغرب کی برہنہ تہذیب کے عالمی مرکز میں گزری تھی۔

ڈاکٹر حمید اللہ کو عشق ومعرفت کی لذت سے آشنائی تھی، وہ تزکیہ باطن کو ضروری سمجھتے تھے، عام طور پر علمی خدمات کے تذکرہ میں زہد واستغناء، قناعت وستقامت، تقوی وخشیت اور للّٰہیت، تزکیہ واصلاح اور سادگی وانسانیت نوازی کا ذکر پردہ خفا میں رہ جاتا ہے، ڈاکٹر حمید اللہ کی زندگی کے یہ پہلو واقعی بہت مفید ومؤثر اور پرکشش ہیں، اس حیثیت سے ان کی زندگی کا مطالعہ طلبہ، علماء اور بالخصوص عصری دانشگاہوں کے مسلم اساتذہ واسکالرز کے لیے بہت مفید ہے، اسی کی عقل مفید وقابل تقلید ہے جس کا دل درست ہے، اسی کا علم نافع اور صفت دوام سے متصف ہے جس کو تزکیۂ باطن کی دولت بھی ملی ہے، اس کا ایمان واقعی مثالی ہے جس کا اظہار بڑی شان سے کفرستان میں ہو، اس کے استغناء وزہد کا کیا کہنا جو کسب مال کے تمام وسائل مہیا ہونے کے بعد بھی قانع وزاہد رہے، بلکہ ہاتھ آئی دولت بھی اسلام کے نام پر لٹا دے، ہمارے عہد کے علماء واہل قلم اور دانشوران کے لیے اس حیثیت سے ان کی زندگی کا مطالعہ شاید انقلاب آفریں ہو، سچ ہے کہ ان کے جیسا متوکل وقانع، دیدہ ور، علم وعمل کا پیکر سود وزیاں سے بے خبر، معاد سے باخبر، علوم اسلامیہ کا جبل پیکر، کفرستان میں اسلام کا نقیب ومبلغ شخص صدیوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ سراپا علم ودانش تھے، علوم اسلامیہ سے وابستہ کس ملک کا کون سا اسکالر ہے جو ڈاکٹر حمید اللہ کے نام سے واقف نہ ہو، لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کبھی خودفریبی میں مبتلا نہ ہوئے، کبھی منصۂ شہود پر جلوہ نمائی کی ادنی سی کوشش بھی نہیں کی، وہ سادگی وپارسائی اور خاکساری میں یکتائے زمانہ تھے، آج ہمارے معاشرے میں خودفریبی کی وبا نے کیسے کیسے رعونت پسند پیدا کر دیے ہیں، نسبتوں کا ڈھنڈورا ہے، زہد وپارسائی کے بلند بانگ دعوے ہیں، علم کی نمائش ہے، لیکن اکثر وبیشتر ایسا ہوتا ہے کہ سابقہ پڑتے ہی علم وعلماء سے اعتماد اٹھنے لگتا ہے، ڈاکٹر حمید اللہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں دیکھ کر، جنہیں پڑھ کر اور جن کی شخصیت سے واقفیت حاصل کر کے علم وعلماء پر اعتماد بحال ہوتا ہے، اسلاف کی یاد آجاتی ہے، دین کی خدمت کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے، تزکیہ کے رموز کھلتے ہیں، علم کی عظمت سمجھ میں آتی ہے، استغناء کی زرہ کی قیمت معلوم ہوتی ہے، میخانہ میں رہ کر مے سے پرہیز کا ہنر معلوم ہوتا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اس یقین میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے کہ ہوا گو کسی قدر تند وتیز ہے، عناد ومخالفت کا طوفان رست خیز ہو، حق دشمنی کا سیلاب بلا خیز ہو مگر حق تعالیٰ اپنے دین کے دفاع کے لیے ایسے مردان درویش کو پیدا کرتا رہتا ہے جو دفاع دین، دعوت حق اور تفہیم شریعت اور تحفظ شریعت کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں، بیسویں صدی اس حیثیت سے بڑی ممتاز رہی ہے کہ اس میں مغرب کے ہنگامہ خیز طوفان کا دندان شکن جواب دینے والے متعدد اہل اللہ معرض وجود میں آئے،

جنہوں نے اپنی قربانیوں کے ذریعہ اسلام پر اعتماد بحال کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔

کمال وجامعیت تو صرف انبیاء کے لیے خاص ہے، مگر کمال وجامعیت کی ایک مخصوص مقدار اللہ اپنے مخصوص بندوں کو بھی عطا کیا کرتا ہے، ڈاکٹر حمید اللہ ایسے ہی با کمال وجامع صفات لوگوں میں تھے جن کو دنیا یاد کرے گی، بیسویں صدی میں عالمی اور مذہبی اعتبار سے شخصیات کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے، مگر کسی کا کسی سے موازنہ قدرے مشترک میں تو درست ہے، لیکن مختلف مزاج، متنوع طبیعت اور مختلف کاموں کے درمیان موازنہ درست نہیں، اپنی خدمات، اپنے کمالات اور اپنے اوصاف کے لحاظ سے ڈاکٹر حمید اللہ ممتاز ومنفرد اور لائق تقلید تھے، ان پر سیکڑوں شعر صادق آتے ہیں مشہور ترین مصرعے ان پر منطبق ہوتے ہیں، ان کی وصف نگاری میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جاسکتے ہیں مگر سچ یہ ہے کہ ایسا کہاں سے لائیں کہ ان سا کہیں جسے۔ تقبل اللہ منا ومنہ۔

پروفیسر محسن عثمانی نے ان کی زاہدانہ زندگی کو اس شعر کے ذریعہ خراج عقیدت پیش کیا ہے(۱۶) ؎

رند قانع متوکل ہے خدا دیتا ہے
وہ جا پاتا ہے وہ پیتا ہے، پلا دیتا ہے

پروفیسر نثار احمد فاروقی نے انھیں ''آیۃ من آیات اللہ'' قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایک بے مثل عالم تو ہیں ہی، عام لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ وہ قرون اولی کے عباد اللہ الصالحین کی طرح نہایت سادہ زندگی گزارتے ہیں، پیرس جیسی عشرت گاہ میں، ایک چھوٹے سے کمرے میں، جس میں آرائش کا کوئی سامان نہیں، قناعت اور توکل کے ساتھ رہتے ہیں، نام ونمود، شہرت وعزت، مال ودولت، جاہ اقبال سب سے بے نیاز رہ کر صرف اور صرف خدمت دینی میں اپنا ایک ایک سانس صرف کرتے ہیں''(۱۷)۔

☆☆☆

حواشی

(۱) ڈاکٹر محمد حمید اللہ/ پروفیسر عبد الرحمٰن مومن ص۵۰
(۲) مصور سابق ص۸۰-۸۱
(۳) // ص۹۷
(۴) // ص۱۴۱
(۵) کلیدی خطبہ حمید اللہ بین الاقوامی سیمینار، آئی، ایس دہلی/ پروفیسر محسن عثمانی
(۶) ڈاکٹر محمد حمید اللہ/ پروفیسر عبد الرحمٰن مومن ص۱۵۸
(۷) خطبات بہاولپور/ڈاکٹر حمید اللہ ص۴۲۲
(۸) وہ جو بیچتے تھے دوائے دل/مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ص۲۴۲
(۹) ڈاکٹر حمید اللہ/ پروفیسر عبد الرحمٰن مومن ص۱۴۴
(۱۰) مصور سابق، ص۸۲
(۱۱) // ص۸۹-۹۰
(۱۲) // ص۱۱۳
(۱۳) // ص۱۱۷
(۱۴) // ص۱۳۲
(۱۵) // ص۱۳۶
(۱۶) // کلیدی خطبہ/ پروفیسر محسن عثمانی
(۱۷) (خطبات بہاولپور، پیش لفظ ص۶ مطبوعہ اسلامک بک فاؤنڈیشن دہلی ۱۹۹۷ء)۔

☆☆☆

فکر اسلامی

(قسط-۱۳)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

عقیدہ کی حفاظت کا بے لاگ جذبہ

جو لوگ حضرت مولانا پر بے جا مصلحت پسندی کی دبیز چادر ڈالتے ہیں کاروان زندگی کا یہ اقتباس اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کافی ہے، جب مولانا کے قلم سے ''دو متضاد تصویریں'' نکل کر منظر عام پر آئی تو کچھ حضرات نے حیرت کا اظہار کیا، مولانا لکھتے ہیں:

''یہ کتاب اگر چہ متکلمانہ اور مناظرانہ طرز پر نہیں لکھی گئی تھی، اور اس میں ادبی اور تاریخی ذوق رکھنے والوں کے لئے دل چسپی اور دل آویزی کا سامان بھی تھا، پھر بھی راقم کے ان چند دوستوں کو میرا اس موضوع پر قلم اٹھانا پسند نہیں آیا جو مجھے دین کا ایک مثبت و ایجابی داعی ''تاریخ و دعوت و عزیمت'' کا مصنف اور ممالک عربیہ و اسلامیہ کو دعوتِ اصلاح و انقلاب دینے والا اہل قلم سمجھتے تھے، چنانچہ کئی دوستوں نے اس پر اظہارِ حیرت کیا، اور اپنی اس توقع کا اظہار کہ میں ایسے قدیم متنازع فیہ مسائل پر قلم اٹھانے کے بجائے جس پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، دعوتی و اصلاحی، تاریخی و ادبی، اور اجتماعی و معاشرتی موضوعات کے دائرہ میں اپنی مساعی اور تحریری کاوشوں کو محدود رکھوں گا، میں نے اس پر نہ اس وقت جب بعض حلقوں کی طرف سے اس پر سوال کیا گیا، ندامت کا اظہار کیا، اور نہ معذرت کا، اور نہ اس وقت نادم اور معذرت خواہ ہوں ''کاروانِ زندگی'' کی پہلی جلد کا مطالعہ کرنے والوں کو معلوم ہے کہ میں نے اپنی ساری ادبی و تاریخی مشغولیوں اور دل چسپیوں اور دعوتی و تصنیفی مشغولیتوں کے باوجود ۱۹۵۸ء میں قادیانیت کے موضوع پر قلم اٹھایا اور میری وہ کتاب اردو، عربی اور انگریزی میں شائع ہو کر مقبول و مشہور ہوئی، اور وہ اس موضوع کی مقبول و مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ شیعیت و قادیانیت دونوں میں ختم نبوت کے انکار کی روح مشترک ہے پھر جب اسلام کے سرحدی خط (Line of Demarcation) کو کوئی دعوت و تحریک یا فرقہ و مسلک پھلانگ جائے تو پھر ایک داعی اور مصنف و اہل قلم کا رویہ اور طرز عمل (خواہ وہ کتنا ہی فراخ دل اور وسیع النظر ہو) سکوت اور غیر جانب داری سے ہٹ کر بے لاگ اظہار حق اور آزادانہ احتساب کی طرف ہو جانا چاہیے، امام ابوالحسن اشعری، امام غزالی، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحب تک سب کا طرز عمل یہی رہا ہے۔ (کاروان زندگی ج۳ص۲۶۰۔۲۶۱۔۲۶۲)

فکر انگیزی اور بصیرت

بابری مسجد کے قضیہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں مولانا نے جو انتھک محنت کی اور جس طرح اس کے ضمن میں پیش آنے والے خطرات کا ادراک کیا وہ ان کی بصیرت اور ملی فکر کی غماز ہے لیکن اس سلسلہ میں جو افسوسناک تجربات ہوئے وہ بھی تاریخی امانت ہے، جس کو مولانا نے غالبا اسی لئے پیش بھی کیا

،اور اس لئے بھی آئندہ اہم اور خطرناک مسائل کو حل کرنے کے لئے اس سے عبرت حاصل کی جائے، کہ مسائل اپنی اہمیت خطرناکی اور نتائج کے اعتبار سے حقیقت پسندی اور قوت ادراک وبصیرت بھی چاہتے ہیں۔

بابری مسجد کے قضیہ کو حل کرنے کے لئے ایک سنجیدہ کوشش ہوئی اس پر مولانا نے کئی کئی گھنٹے کئی دن گفت وشنید کی لیکن جو تجربہ مولانا کو اپنوں سے اس گفت وشنید کا ہوا اس کو مولانا نے تاریخی امانت اور درس عبرت کے طور پر یوں بیان کیا ہے:۔

''معذرت کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ ہم نے ان قابل احترام حضرات میں پیش آنے والے خطرات کا وہ صحیح احساس وادراک اور اس حقیقت پسندی کی کمی محسوس کی جو واقعات پر نظر رکھنے والے اور اس سلسلہ میں مذہبی جذبات اور قومی وقار کے تحفظ کا جذبہ جس حد تک پہونچ چکا اس کے درجہ اور مقدار کو جاننے سے پیدا ہونی چاہئے ،ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سامنے اپنے فریق کی طاقت اور صلاحیت اور اس کے عزائم اور ہمتوں کا وہ نقشہ ہے جو تجربات وحقائق کی دنیا میں اور مختلف مشکلات ومسائل کی موجودگی میں پچھلی تاریخ پر نظر رکھنے والے اور واقعات سے عملی نتیجہ نکالنے والے انسان کے لئے اتفاق کرنا مشکل ہے، چنانچہ دونوں محترم گورنر صاحبان کی اس سلسلہ میں طویل سفر ،دلچسپی اور محنت ہماری شرکت وخواہش اور فکر مندی کے باوجود مسئلہ وہیں کا وہیں رہا جہاں پہلے تھا۔''

(کاروان زندگی۔ج،۴۔ص۔۲۸۷۔۲۸۸)

بروقت بیان اور حقیقت پسندانہ تبصرہ

۱۹۹۲ء میں جب بابری مسجد کو شہید کیا گیا تو اس کے فورا بعد ۶ر دسمبر کو مولانا کا تفصیلی بیان اخبارات میں شائع ہوا جسمیں انہوں اس واقعہ کا کلی ذمہ دار مرکز حکومت کو بھی قرار دیا اور اس واقعہ کو ہندوستان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بتایا،

مرکزی حکومت نے اپنی بدنامی سے بچنے کے لئے چار صوبوں کی B.J.P سرکار کو برخاست کیا اور ۱۰ دسمبر کو ۴ مذہبی جماعتوں کو غیر قانونی قرار دیا جسمیں RSS, VHP اور بجرنگ دل کے علاوہ جماعت اسلامی بھی شامل تھی، اس پر مولانا نے جو بروقت بیان نشر کرایا، وہ ان کی وسعت قلبی، قائدانہ کردار، ملی فکر اور اداءِ فریضہ کے استحضار پر دلالت کرتا ہے:

''ہندوستان کے ممتاز عالم دین اور آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب نے ان جماعتوں میں جو وزیر اعظم ہند نرسمہا راؤ جی کے اعلان کے ذریعہ ممنوع وخلاف قانون قرار دی گئی ہیں، جماعت اسلامی ہند کی شمولیت پر اپنے استعجاب کا اظہار کیا ہے، اس لئے کہ یہ جماعت ایک اصلاح وتربیتی اور دینی وفکری جماعت ہے، اور اس کا عملی، جارحانہ، اور فرقہ ورانہ سیاست سے تعلق نہیں، ان ممنوعہ فرقہ وارانہ جماعتوں میں جماعتِ اسلامی کی شمولیت پر بیرونی دنیا اور مسلم وعرب ممالک میں تعجب وناپسندیدگی کا اظہار کیا جائے گا، اس لئے کہ ان ممالک کے علمی ودینی حلقوں میں یہ جماعت اسی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہے کہ وہ ایک اصلاحی وفکری جماعت ہے''۔(کاروان زندگی ج ۵ ص ۱۱۳)

بلندی سے خطاب

نرسمہاراؤ کے وزیر اعظم بننے کے بعد مولانا نے ان کو مکتوب لکھا اس کی تمہید میں لکھتے ہیں:

''میں اس نازک موقع پر مذہب، اخلاقیات اور تاریخ و سیاست کا ایک وسیع مطالعہ کرنے والے مصنف اور ایک ایسے محبّ وطن کی حیثیت سے (جو ان معروضات پیش کرنے اور اس عریضہ کے ذریعہ ملک کی سب سے بڑی ذمہ دار شخصیت سے تعلق ورابطہ قائم کرنے کے ذریعہ کوئی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، ذاتی اور جماعتی غرض نہیں رکھتا) آپ کی خدمت

میں مخلصانہ اور بے غرضانہ طریقہ پر کچھ مشورے اور حقائق پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں''۔(کاروان زندگی ج۵ ص۳۹)

''میں اس وقت آپ کا قیمتی وقت جزئی مسائل ، ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت (مسلمانوں) کی شکایات و ضروریات کے تذکرہ میں صرف نہیں کروں گا، میں اس وقت جو کچھ عرض کروں گا وہ ہندوستان کے عمومی مفاد میں اور اصولی انداز میں ہوگا''(کاروان زندگی ج۵ ص۴۰)

خطرہ کا ادراک اوراس کے تدارک کی کوشش: جب مولانا نے الکفر ملة واحدة کا مشاہدہ کیا تو یوں کہا کہ یہود ونصاریٰ جو آپس میں سب سے زیادہ اختلاف رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے تضاد رکھتے ہیں جس کو قرآن نے بھی وقالت الیهود ....الخ۔ کہہ کر تصویرکشی کی ہے، اور دیکھا کہ سب مل کر مذہب کی بالا دستی کا مطالبہ کرنے والوں اور اسلام کے نفاذ کی بات کہنے والوں اور اصول و اقدار پر عمل کا مطالبہ کرنے والوں کو Faundamentalist کہا جا رہا ہے اور اس کے ذریعہ لوگوں کو اسلام سے دور کیا جا رہا ہے بلکہ بعد میں تو اسی کا سہارا لیکر ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تو مولانا نے بر وقت اس پر توجہ کی اور عالم عرب کے علماء کو مخاطب کیا:

''اس وقت Fundamentalist کی اصطلاح اتنی عام ہوگئی ہے کہ اب یہ اصطلاح ممالک عربیہ میں پہنچا دی گئی ہے، وہاں اس کے لئے ''مبدئین'' ''رجعیین'' ''متزمتین'' ''متطرفین'' کے الفاظ پہلے سے موجود تھے، اور اس کے مقابلہ میں ''متنورین'' اور ''تقدمیین'' (روشن خیال اور ترقی پسند) کے الفاظ اہل قلم اور مقررین استعمال کرتے تھے، ابھی ہمارے پاس ایک عرب علاقہ سے خط آیا ہے کہ متشددین کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ہم چند مفکرین اور علماء کے نام ایک سوال نامہ بھیج رہے ہیں کہ جو احکامِ شریعت اور اسلام کی تعلیمات کے مطابق حکومت اور معاشرہ کو ڈھالنا چاہتے ہیں، اور اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں، ان کے بارہ میں آپ کا کیا خیال ہے؟

Fundamentalist کا ترجمہ تو اصل میں ''مبدئین'' ہے جو مبادی واصول پر یقین رکھتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا سارا فساد یہ ہے کہ کسی اصول پر، کسی بنیاد پر یقین نہیں ہے، خالص نفس پرستی ہے اور اپنے نفس کی تسکین کا سامان کرنا ہے وہ خواہ تمام مسلمہ اصولوں کے خلاف ہو اور پورے معاشرہ پر، انسانیت پر، عہد پر اس کا خواہ کچھ بھی اثر پڑے لیکن اپنا کام نکالنا ہے، یہ معنی تھے بے اصولی کے اسی بے اصولی نے دنیا کو آج اس جگہ پہنچا دیا ہے کہ کسی وقت بھی اس کی قیامت آسکتی ہے، اصل قیامت تو اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر لائے گا، لیکن قیامت صغریٰ کسی بھی وقت ہوسکتی ہے، پہلی جنگِ عظیم بھی ایک طرح کی قیامت صغریٰ تھی، دوسری جنگِ عظیم بھی، ایسی جنگیں پھر ہوسکتی ہیں، اور اس سے بڑے پیمانہ پر ہو سکتی ہیں، وہ صرف برطانیہ اور جرمنی کی جنگ تھی، اس میں کچھ اور طاقتیں شامل ہوگئی تھیں، اور دوسری جنگ بھی ایسی تھی، اس وقت ایٹمی ہتھیار بھی نہیں تھے، اب ایٹمی ہتھیار بھی ہیں، دوسرے اس جنگ کا رقبہ اس سے کہیں زیادہ ہوگا، اور وہ سب نتیجہ ہوگا بے اصولی کا، نفس پرستی کا، مطلق آزادی کا اور دین سے دوری کا، لیکن ان ترقی پسندوں اور اسلام دشمنوں کو شرم نہیں آتی انہوں نے یہ اصطلاح ایجاد کی حالانکہ سارا فساد ہی یہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ظهر الفساد في البر والبحر بما كسبت ايدى الناس ليذيقهم بعض الذى عملوا لعلهم يرجعون'' (کاروان زندگی ج۵ ص۱۶۳-۱۶۴)

مزید اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وقت بڑا نازک اور خطرناک ہے، اس میں تحریری صلاحیت ، بیانی صلاحیت ، خطابت کی صلاحیت، تفہیم کی صلاحیت، تبادلۂ خیال کی صلاحیت، ان سب چیزوں کی ضرورت ہے، یہ ایک عالمی سازش ہے جو وسیع پیمانہ پر بھی ہے اور نہایت گہرے پیمانہ پر بھی، اس کے مضمرات بہت دقیق اور عمیق ہیں، اتنی بڑی سازش کم سے کم میرے محدود مطالعہ میں نہیں ہوئی ہے، یہودی و عیسائی اس پر متحد ہو گئے ہیں کہ دنیا میں (Fundamentalist) کا مقابلہ کیا جائے، یعنی کوئی اصول ہی باقی نہ رہے، حدود ہی باقی نہ رہیں، سب کر سکتے ہوں، جیسا کہ یونان کا ایک فلسفہ تھا لذتیت (عربی میں ابیقوریۃ) Epicureanism اس کا تاریخ اخلاق یورپ میں اسی طرح ذکر آتا ہے، لذتیت کے معنی یہ تھے کہ جس میں مزہ آئے وہ کرنا چاہیے، آج کا یورپ گویا بالکل اسی انداز سے سوچ رہا ہے، یورپ کا پورا دماغ گویا لذتی ہی بن کر رہ گیا ہے، جس میں مزہ آئے، جس میں فائدہ ہو وہ کرو، البتہ لذت کو انہوں نے اور وسیع کر دیا ہے کہ لذت بطن یا لذت لسان ہی نہیں بلکہ وہ لذتِ ذہن بھی ہے، لذتِ سیاسی بھی اور لذت سائنسی بھی اس میں شامل ہے، اور وہ جو ایک فاتحانہ خوشی ہوتی ہے وہ بھی اس میں شامل ہے، یہ اس وقت کی اتنی گہری سازش ہے جس سے بڑھ کر کوئی سازش نہیں اور اس کے آثار نظر آرہے ہیں، عرب ممالک میں بھی، خلیج میں بھی یہ بات اب داخل ہوگئی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ متشددین کا مقابلہ کرنا چاہیے، الجزائر تونس اور لیبیا میں تو یہ معرکہ پہلے سے گرم تھا اور وہاں مذہبی جذبہ، وسیع دینداری، اور اسلام کے غلبہ کی کوشش کے خلاف صلیبی جنگ ہو رہی ہے۔

متشددین کی کیا مانگیں ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ معاشرہ اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہو، اس میں خوف خدا ہو، خوف آخرت ہو، اس میں دوسروں کے حقوق کا لحاظ ہو، جو لوگ ''احکام شرعیہ'' کو جاری کرنا چاہتے ہیں (تعزیرات تو بڑی چیزیں ہیں) جو روز مرہ کے حالات میں قابلِ عمل حدود کے اندر احکام شرعیہ کا اجراء چاہتے ہیں، ان سے بھی حکومتیں ڈر رہی ہیں اور وہاں سے نکلنے والے اخبارات اور وہاں سے آنے والے خطوط سے یہ حقیقت جھلکتی ہے۔ (کاروان زندگی ج ۵ ص ۱۶۵-۱۶۶)

ملک و ملت کا شدید احساس

پٹنہ میں پیام انسانیت کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے جو بات فرمائی وہ واقعی قابل تقلید ہے، لوگ واقعات کو کس طرح فراموش کر دیتے ہیں، بڑے بڑے مسائل سے کس طرح دامن چھڑا لیتے ہیں، لیکن جس کے اندر حقیقی تڑپ اور جذبہ ہوتا ہے اس کی تصویر دیکھیے:

'' میں آپ سے بے تکلف کہتا ہوں کہ ۹/ جنوری (۱۹۹۳ء) کو میری ملک کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ جی سے دہلی میں ملاقات ہوئی، انہیں تاریخوں میں مجھے اسلامی دنیا کی سب سے بڑی نمائندہ اور معزز تنظیم رابطۂ عالم اسلامی (World Islamic League) واقع مکہ معظمہ کی طرف سے جس کا میں فاؤنڈر ممبر ہوں، دعوت نامہ وصول ہوا تھا اور سفر کے سب انتظامات تھے، میں نے جانے سے اس لئے معذرت کر دی کہ اگر ۶/ دسمبر کے واقعہ اور اس کے بعد کے فسادات کا ذکر آیا اور مجھ سے سوال کیا گیا، تو میں کیا جواب دوں گا؟ جھوٹ بول نہیں سکتا، سچ کہہ نہیں سکتا، اس لئے میں نے نہ جانے کو ترجیح دی اور ایسا ایک دو بار پیش آیا'' (کاروان زندگی ج ۵ ص ۱۹۷)

(...... **جاری**)

☆☆☆

❑ خاص تحریر (پہلی قسط)

میانمار- ایک مطالعہ

شان محمد ندوی
استاذ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

برما (موجودہ میانمار) کی ریاست اراکان (موجودہ رخائن) میں روہنگیا مسلمانوں کی نسل کشی اور موجودہ ظلم وستم کی داستان کو سمجھنے کے لئے کچھ غیر معمولی تاریخی حقائق ایسے ہیں جن سے شناسائی ضروری ہے۔

اراکان (جواب برما کا مغربی صوبہ ہے) ۱۷۸۴ء تک آزاد خود مختار ملک رہ چکا ہے۔ اور جغرافیائی اعتبار سے اہم حیثیت کا حامل ہے، اس کا کل رقبہ انگریزوں کے زمانہ میں تقریبا ۲۰۰۰۰ کلومیٹر تھا، یہ خلیج بنگال کے مشرقی ساحل سے ملا ہوا جنوب اور شمال میں دور پھیلا ہوا ایک لمبی پٹی کی طرح ہے، مشرق میں Chin Hills ہے اور ناقابل گزر پہاڑوں کے لمبے سلسلہ کی وجہ سے یہ برما سے بالکل الگ ہے، اور اراکان بے بہا قیمتی چیزوں کا مخزن بھی ہے، عمدہ قسم کا ساگوان، شہتیر، بانس، ربر، چاول اور مچھلیوں کی وجہ سے یہ شروع ہی سے تاجروں کے زیر نظر رہا ہے، خصوصا عرب تاجر جو کہ قدیم زمانہ میں تجارت کے بادشاہ تھے انہوں نے تجارتی مقاصد کی وجہ سے اراکان میں چھوٹی چھوٹی تجارتی کالونیاں تعمیر کی تھیں۔

اور سب سے بڑھ کر اراکان کے اندر گیس، تیل اور دیگر معدنیات کے بڑے بڑے ذخائر موجود ہیں، Forbes (جو ایک امریکن بزنس میگزین ہے) اس نے اس کی وضاحت بھی کی ہے، لیکن اس بات کو اب تک بالکل پوشیدہ رکھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج برمی مسلمان Geo-politic اور ذاتی مفاد کے شکار ہیں۔

اراکان میں قوموں کی آمد:

قدیم تاریخی دستاویزوں کے مطابق اراکان ہندوؤں کی سرزمین تھی، مزید تاریخ نگاروں کے یہاں ۲۶۶۶ قبل مسیح تک حکومت کرنے والے ہندو راجاؤں کی ایک لمبی فہرست کا ذکر ملتا ہے، اور اس وقت ان کا دارالسلطنت ''Dhannavati'' نامی ایک شہر تھا جو ''Lemro'' ندی کے کنارے قائم تھا، مسٹر کولس اپنی کتاب ''The land of great image'' میں لکھتے ہیں:

''منگول کے حملہ کرنے سے پہلے اراکان میں Dhannavati نام کا ایک شہر قائم تھا اور جب میں نے ۱۹۲۴ میں وہاں کے پہاڑی علاقوں کی زیارت کی تو وہاں پانچویں صدی قبل مسیح کے Gupta style میں تراشے دیوی دیوتاؤں کے مجسموں کو پڑے ہوئے دیکھا''۔

Dr. S.B. Qanungo اپنی کتاب ''A history of chittagong'' صفحہ ۱۳۶ میں نقل کرتے ہیں کہ:

''پہلی صدی میں بدھسٹوں نے اراکان آنا شروع کر دیا تھا، لیکن آٹھویں صدی کے شروع میں جب ہندستان میں قائم

موریا بادشاہت کا زوال ہوا تو انتہاپسند ہندوؤں نے بدھسٹوں پر قہر ڈھانا شروع کر دیا، بالخصوص ''Magadah'' (بہار کا پرانا نام) کے بڈھسٹوں پر اور ان کو وہاں سے انخلا پر مجبور کیا تو ان لوگوں نے وہاں سے راہ فرار اختیار کی اور اراکان میں چندر بادشاہ کی ماتحتی میں پناہ لی''۔

مسلمانوں کی آمد:

مسلمانوں کی آمد کے سلسلہ میں تاریخ نگاروں نے مختلف باتیں کہی ہیں۔ Mr. R.B. Smart اپنی کتاب ''Burma gazetter'' میں لکھتے ہیں: ''۷۸۸ء میں اراکان میں ''Mahataing Sandya'' نامی بادشاہ تخت نشیں ہوا، اس نے ایک شہر ویسالی ''Vesali'' کی بنیاد ڈالی، ۲۲ سال حکومت کرنے کے بعد اس دنیا سے رخصت ہوگیا، اسی کے دور حکومت میں Ramree جزیرہ پر کئی کشتیاں تباہ ہوگئیں اس میں سوار مسافر مسلمان تھے، ان سب کو اراکان بھیج دیا گیا وہ سب وہیں بس گئے''۔

U kyi اپنی کتاب ''History of Burma'' صفحہ ۱۶۰ میں نقل کرتے ہیں:

''عرب تاجر اپنی تجارت کے ساتھ ساتھ وہاں کے باشندوں کو دین کی دعوت بھی دیتے، نہایت اعلیٰ اخلاق اور ایماندار ہوتے تھے، اور ان کی دعوت اتنی متأثر ہوتی تھی کہ پوری کی پوری جماعت اسلام میں داخل ہو جاتی''۔

ڈاکٹر محمد یونس ''A history of Arakan'' میں لکھتے ہیں:

''دراصل ۱۳ صدی تک جزیرہ اوقیانوس کے ساحلی علاقہ اور بنگلہ دیش تک کے لوگوں کے دلوں کو اسلام نے فتح کر لیا تھا، اراکان چونکہ بنگلہ دیش سے ملا ہوا ہے اسی وجہ سے اسلام نے وہاں پر بھی اپنے قدم بہت جلد جما لیے''۔

اس طرح دنیا کے تین بڑے مذاہب اراکان میں ایک ساتھ پروان چڑھنے لگے۔

منگولیوں کا حملہ:

اراکان پر ہندو بادشاہ یکے بعد دیگرے حکومت کرتے چلے آرہے تھے کہ ۹۵۷ء میں منگولیوں نے اراکان پر حملہ کر دیا اور ہندو بادشاہت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا، ہندوؤں کو مجبوراً بنگلہ دیش میں پناہ لینی پڑی، ہندو دوبارہ کبھی ابھر نہ سکے کہ اپنی زمینوں کو منگولیوں کے قبضہ سے لیتے یا ان پر حملہ کرتے۔

منگول جو کہ وحشی صفت انسان تھے، انہوں نے پورے اراکان کا تانہ بانہ بکھیر کے رکھ دیا، اس زمانہ کو تاریخ نے Age of darkness سے یاد کیا ہے۔

لیکن آہستہ آہستہ منگول بدھسٹوں اور مسلمانوں کی تہذیب میں گھل مل گئے۔

اراکان سے ہندوؤں کے خاتمہ کے بعد صرف مسلمان اور بدھسٹ باقی بچے، بدھسٹ جگہ کی مناسبت سے ''Maghs'' کے نام سے مشہور ہو گئے، جبکہ مسلمان روہنگیا ''Rohingas'' کہلائے۔

مسلم دور حکومت: عروج و زوال:

۱۳۷۴ء تک منگولیوں اور بدھسٹوں کی مشترکہ حکومت رہی اور اس کڑی کا آخری بادشاہ Narameikhla تھا یہ مذہبی اعتبار سے بدھسٹ تھا لیکن اس کے باوجود اس کے تعلقات بنگلہ دیشی مسلمانوں سے بہت گہرے تھے۔ اس کی بہت بڑی مثال تاریخ میں ملتی ہے کہ جب ۱۴۰۴ء میں اس کو حکومت سے معزول کیا گیا تو بجائے اس کے کہ وہ برما چلا جاتا یا اور جہاں بدھسٹ اکثریت میں تھے وہاں پناہ لیتا؛ لیکن Narameikhla نے بنگلہ دیش جانے کو ترجیح دی، جہاں سلطان غیاث الدین نے پر جوش طریقہ سے اس کا استقبال

کیا، بنگلہ دیش میں قیام کے دوران Narameikhla نے اسلام قبول کیا، اور اپنا نام سلیمان شاہ رکھا، اسلام کے تمام احکامات سیکھے، پھر جنرل والی خان (جو بنگلہ دیشی فوج کے کمانڈر تھے) کے ہمراہ ۵۰۰۰۰ سپاہیوں کو لے کر اراکان پر چڑھائی کردی اور ۱۴۳۰ء میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔

پھر ۱۴۳۰ء سے ۱۶۳۸ء تک مسلمانوں کے گیارہ بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے بڑی شان سے اراکان پر حکومت کی، لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ سلیمان شاہ کی طرح سارے بادشاہ کنورٹڈ (Converted) مسلمان تھے، Maruk-U ایک نہایت خوبصورت شہر ان کا دارالحکومت تھا جو کہ روہنگیا مسلمانوں کو دل وجان سے بھی زیادہ عزیز تھا، مرکزی زبان پرشین تھی، اور بڑے پیمانہ پر مدارس ومساجد کا وجود تھا، اس دور کو تاریخ نگاروں نے Golden era of Arakan کے نام سے یاد کیا ہے۔

لیکن مسلمانوں کے آپسی خلفشار اور حالات سے ناواقفیت اور بدھسٹوں کی گہری سازش جو کہ انتہائی عروج پر پہنچی ہوئی تھی اور سب سے بڑھ کر دین سے دوری کے سبب سلیمان شاہ ثانی کی وفات کے بعد ۱۶۳۸ء میں حکومت بدھسٹوں کے ہاتھ سے چلی گئی اور اراکان کا زوال شروع ہوگیا، اراکان کا وہ عظمت ووقار اور بالا دستی جس کو مسلمانوں نے صدیوں سے قائم کیا تھا خاک میں مل گیا۔ مسلمانوں کی تاریخی نشانیوں کو سپرد خاک کر دیا۔ اور Maruk-U جو مسلمانوں کا دارالسلطنت تھا اس کو ڈھا کر وہاں بڑی بڑی مذہبی عمارتیں تعمیر کر دیں جو آج بھی موجود ہیں۔ اور مسلمانوں کو لوٹنا شروع کر دیا گویا کہ ایک عام رہزنی، استحصال اور لوٹ مار کا دور شروع ہوگیا ہو جس کی وجہ سے مسلمان Chittagong (جو کہ بنگلہ دیش میں ہے) میں پناہ گزیں ہوگئے۔

برما انگریزوں کے قبضہ میں:

۱۸۲۳ء میں جب انگریزوں نے برما پر قبضہ کیا تو اراکان بھی ان کی ماتحتی میں آ گیا، پھر انگریزوں نے برما سے لے کر اراکان تک اپنا نظم ونسق قائم کیا، جس کی وجہ سے کچھ مدت کے لئے امن وامان بحال ہوا تو وہ مسلمان جو حالات کے پیچیدہ ہونے کی وجہ سے اراکان سے منتقل ہوگئے تھے پھر آ کر اپنی زمینوں پر آباد ہوگئے، آج یہ کہنا کہ مسلمان اراکان میں انگریزوں کے زمانہ میں داخل ہوئے اس سے پہلے وہاں موجود نہیں تھے یہ بالکل غلط، اور تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہے، ڈاکٹر محمد یونس اپنی کتاب ''A history of Arakan'' میں لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ بہت سے وہ مسلم خاندان جو انگریزوں کی آمد سے پہلے یہاں صدیوں سے آباد تھے بدھسٹوں کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے وقتی طور پر بنگلہ دیش کے جنوبی حصہ میں چلے گئے تھے حالات بہتر ہوتے ہی اپنی زمینوں پر واپس آ گئے''۔

برما کی آزادی کے بہانے تنظیموں کا قیام اور ان کے مقاصد:

جب پورے برما اور اراکان پر انگریزوں نے مکمل قبضہ کر لیا، تو بدھسٹوں نے اپنی آزادی کی کوشش شروع کر دی، اس کے لئے انہوں نے مختلف تنظیمیں بنائیں، نام الگ تھے لیکن سب کے مقاصد ایک تھے، وہ تھے مسلمانوں سے نفرت اور ملک کی آزادی جبکہ انگریزوں نے Devide and rule کے تحت مزید اس میں آگ لگادی تھی۔

۱۹۰۶ء میں رنگون کالج کے طالب علموں نے ''Yung men Buddist Association'' (YMBA) نامی ایک تنظیم بنائی جس کا مقصد خاص طور پر بدھسٹوں کو تعلیمی

اور سماجی کام میں پرموٹ کرنا تھا۔YMBA نے ۱۹۱۷ء سے سیاسی تحریکوں میں حصہ لینا شروع کر دیا لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ تنظیم (GCBA)'' The General Council of Bermese Association'' میں ضم ہوگئی جو برمی عوام کے حقوق کے لئے پہلے ہی سے سرگرم تھی۔اس تنظیم کا کام بڑا ہی پرخطر تھا۔

مسلسل بدھسٹوں کو بھڑکانا غیر ملکوں کے خلاف نفرت کو ہوا دینا، ہندستانی لوگوں کو باہر نکالنے اور ان کی جائیداد کو ہڑپنے کے لئے مسلسل جوشیلی تقریریں کرنا، جس کے سبب ۱۹۳۰ء میں ہندستانیوں کے خلاف فرقہ ورانہ فساد رنگون میں عام ہوگیا جس میں اچھا خاصا مسلمانوں کو نقصان پہونچا۔

۱۹۳۰ء ہی میں ایک اور تنظیم سامنے آئی جس کا نام'' Do Ba Ma Asiayone'' جس کا انگریزی ترجمہ ''Our Burma Associaltion''(OBA) ہے جس کے بانی یونیورسٹی کے طلبہ تھے جن کا نارہ Thakins یعنی ''Masters'' تھا۔ جنھوں نے دوبارہ ہندستانیوں کے خلاف فساد کی لہر پورے ملک میں عام کر دی اور انہیں Wipe out کرنے کا پورا پلان تیار کیا، لیکن بدھسٹ عوام کے لئے روہنگیا مسلمان اور مشرقی، مغربی اور سنٹرل برما میں مقیم مسلمانوں کے بیچ یہ فرق کر پانا کہ کون یہاں کا مقامی ہے اور کون غیر ملکی بہت دشوار تھا، جس کے نتیجہ میں برمی بدھسٹ عوام نے بلاتفریق ان پر حملہ کر دیا۔دوسری طرف برما کے مذہبی اور سیاسی رہنما اراکانی بدھسٹوں کو Thakins پارٹی میں شامل کرنے کے لئے اراکان روانہ ہوگئے۔ ان کے پیش نظر دو مقاصد تھے یعنی ایک تو برما کو انگریزوں کے قبضہ سے آزاد کرانا، دوسرے اراکانی بدھسٹوں کے دل ودماغ میں روہنگیا مسلمانوں کی نفرت کا بیج بونا تا کہ اراکانی بدھسٹ اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے الگ کر سکیں۔

اس طرح برمی لیڈروں نے اپنی پوری قوم کو متحد کر لیا۔ پھر پوری جمعیت کے ساتھ برما کی British حکومت سے علیحدگی کا سوال اٹھایا۔

یہاں ایک بات قابل توجہ ہے کہ جب بدھسٹوں نے برما کی آزادی کا سوال اٹھایا اس وقت British حکومت نے ۲۴ بدھسٹ مندوبین کو جو مختلف تنظیموں کی نمائندگی کر رہے تھے لندن میں بلایا، سب کا پر جوش استقبال کیا، پھر ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء سے ۱۲ جنوری ۱۹۳۲ء تک ایک'' Burma Round Table Conference'' منعقد کی لیکن جو سب سے زیادہ تشویش میں ڈالنے والی بات ہے وہ یہ ہے کہ اراکان کے روہنگیا مسلمانوں کی طرف سے کوئی بھی نمائندہ مدعو نہیں کیا گیا جبکہ اراکان ہی کے مگھ بدھسٹوں کی نمائندگی کے لئے Mr. Tum Aung Gyaw کو مدعو کیا گیا۔

برما کی آزادی اور مسلمانوں پر حملے:

۱۹۳۷ء میں برما British حکومت سے آزاد ہوا اور ''Hom Role'' کی اجازت ملتے ہی Thakins پارٹی نے نظم ونسق پر پورا کنٹرول حاصل کر لیا، برما کی علحدگی کے ایک ہی سال کے بعد ۱۹۳۸ء میں دوبارہ رنگون میں Anti-Muslim فساد کو ہوا دی گئی اور دوسری طرف Thakins پارٹی کے سربراہ Aung Sun نے اراکان کا خفیہ دورہ کیا Myebon شہر میں منعقد ہونے والی Conference میں شرکت کی اور فوج کو منظّم کرنے کے سلسلہ میں اراکانی بدھسٹ لیڈروں سے بات کی اور ساتھ ہی ساتھ اراکان کے روہنگیا مسلمانوں کے بارے میں خفیہ منصوبہ بندی کی۔اور جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو برما کو مکمل آزادی کا پروانہ سونپ دیا گیا۔مکمل آزادی ملتے ہی

Aung San جو Thakin پارٹی کا سربراہ تھا اپنے تیس ساتھیوں کو لے کر خفیہ طور پر جاپان چلا گیا جہاں اس نے جاپان کی سربراہی میں Burma Independence Army(BIA) بنائی، پھر جاپان ہی سے ۲۳ دسمبر ۱۹۴۱ میں رنگون کے اس حصہ میں بمباری کروائی جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ پھر BIA کا پہلا گروپ جاپان میں ٹریننگ لینے کے بعد جنرل Ne Win کی سربراہی میں ۱۹۴۲ء میں Moulmein کے راستہ سے رنگون واپس ہوا۔ رنگون کے اس واقعہ سے اراکان کے روہنگیا مسلمان اور برما میں مقیم ہندستانی مسلمانوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اوران کے دلوں میں ڈروخوف بیٹھ گیا۔ جس کے نتیجہ میں برما کے ہندستانی مسلمان ہندستان واپس ہونے لگے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ: برما کا سفر اور فرض منصبی سے آگاہی:

مولانا علیہ الرحمہ نے ۱۸ دسمبر ۱۹۶۰ء میں برما کا سفر کیا اور رنگون (برما) میں ایک ماہ سے زائد قیام کے دوران بیسیوں تقریریں ہوئیں جن میں برمی مسلمانوں کو ان کی تجارت کے ساتھ اس ملک میں اسلام کی حفاظت و اشاعت اور یہاں کی آبادی کو اسلام سے متعارف اور مسلمانوں سے مانوس کرنے کے ضروری کام کی طرف متوجہ کیا، اور صاف طور پر فرمایا کہ اسلام سے متعارف اور صاف طور پر فرمایا کہ اگر یہ کام نہ ہوا تو یہاں مسلمانوں کی خیر نہیں اور نہ ان کی تجارت اور خوش حالی کی کوئی ضمانت ہے، اسی کے ساتھ مولانا نے برمی مسلمانوں کو برمی زبان میں مہارت پیدا کرنے پر بھی زور دیا۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ باتیں جو آپ نے اپنی ایمانی فراست اور داعیانہ بصیرت سے محسوس کر کے اندیشہ کے طور پر فرمائیں تھی بالکل صحیح ثابت ہوئیں۔

دراصل مولانا کے سفر کے وقت برما میں جمہوری حکومت قائم تھی، لوگوں کے پاس دولت کی خوب فراوانی تھی، وہ بھول گئے تھے کہ جو مسلمان وہاں بستے تھے وہ غیروں میں اسلام کی دعوت دیتے اور اسلام کے لئے کوشاں رہتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، بالآخر کمیونسٹوں کا اقتدار آیا جس کے نتیجہ میں ۱۹۴۲ء میں مسلمانوں کے قتل عام اور ۱۹۶۲ء میں فوجی انقلاب ہوا جو مال و دولت سب کچھ بہا لے گیا، اور بہت سے لوگوں نے بھاگ کر اپنے سابق وطن ہندستان و پاکستان میں پناہ لی اور کچھ بھاگ کر لندن اور افریقہ وغیرہ چلے گئے۔

۱۹۴۲ء میں مسلمانوں کا قتل عام:

۱۹۴۲ء میں برما اور اراکان کے مسلمانوں کے ساتھ جو کھیل کھیلا گیا اور جس بے رحمی سے ان کا قتل عام کیا گیا اس پورے سنیریو کو تفصیلی طور پر سمجھنا بہت ضروری ہے۔

دراصل بدھسٹ بہت جلدی میں تھے ان کا مقصد تھا کہ برما کی مکمل آزادی اور اس کے قوانین بننے سے پہلے ہی مسلمانوں کا برما اور اراکان دونوں جگہ سے بالکل صفایا کر دیا جائے، تاکہ ہمیشہ کے لئے ان کا راستہ صاف ہو جائے۔ اور یہ موقع بدھسٹوں کے لئے بہت مناسب تھا۔ اور جبکہ دو قوتیں بھی ان کے ساتھ تھیں، ایک طرف انگریز جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر پس پردہ ان کی مدد کر رہے تھے، دوسری طرف جاپان جو کھل کر بدھسٹوں کا ساتھ دے رہا تھا۔

اس وقت جو مسلمانوں کی حالت تھی وہ بہت نازک تھی اچھی خاصی تعداد میں ہونے کے باوجود زوال کے آخری کگار پر تھے، ان میں کوئی ایسی مضبوط تنظیم نہیں تھی جو ان کو متحد کرتی، سب سے تعجب کی بات تو یہ تھی کہ دشمن کو اپنا دوست سمجھ رہے تھے اور جو سازش ان کے خلاف کی جا رہی تھی اس سے بالکل نا

بلد تھے اور جاپان نے جورنگون پر ۲۳ دسمبر ۱۹۴۱ء کو بمباری کی تھی اس سے ڈرے اور سہمے ہوئے تھے۔

جاپان کا دوسرا حملہ:

انگریزوں کے نکلتے ہی اراکان کا نظم ونسق مگھ بدھسٹوں کے ہاتھ میں چلا گیا، اور UKyaw Khine کو اراکان کا کمشنر بنایا گیا، اس سے بدھسٹوں کو فطری طور پر اتنی خوشی ہوئی کہ اب بدھسٹوں نے دل کھول کر مسلمانوں کو لوٹنا شروع کر دیا اور ایک بار پھر مسلم فساد کو ہوا دیکر مسلمانوں کو منتشر کر دیا۔ اس کے فورا بعد ۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء میں جاپان سے دوبارہ AKyab پر بمباری کروائی۔ یہ ایک باقاعدہ منظّم سازش تھی۔ ایک طرف مسلمان بستیوں پر جاپان سے حملہ کروا کر ان کو منتشر کیا جا رہا تھا، دوسری طرف بدھسٹ خود کو بہت تیزی سے مضبوط اور مستحکم کر رہے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ بدھسٹ براہ راست ایک طرف سے مسلمانوں کا قتل عام اور ان کو لوٹنا شروع کریں، لیکن اس سے پہلے انھوں نے مسلمانوں کے وہ تمام اسلحے جو قانونی طور پر ان کے پاس تھے ضبط کر لئے۔ اور مزید اراکان لیے کمشنر UKyaw Khine نے اراکان سے گولہ بارود سے لدی ہوئی ایک کشتی Minbya اور Kyanutaw روانہ کی جہاں سے حملہ شروع کرنا تھا۔ اب دشمن مکمل ہتھیاروں سے لیس ہو گیا تھا، جبکہ مسلمان اس سر پر کھڑی مصیبت سے ناواقف بے سروسامان نہتے اور خالی ہاتھ تھے۔

بدھسٹ لیڈروں نے خفیہ طور پر آخری میٹنگ Minbya میں کی اور فوج کو کچھ اس طرح ترتیب دیا:

(۱) Thakin پارٹی کے لوگوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک گروہ کے پاس بندوقیں، دوسرے کے پاس تلوار، جبکہ تیسرے کے پاس ڈنڈے۔

(۲) ان فوجوں کی قیادت کی ذمہ داری San Kyw Aung کو دی اور نائب Tun Hla Aung اور Maungkyaw کو بنایا۔

مندرجہ ذیل مقاصد کو پیش نظر رکھا:

(۱) اراکان کی آزاد ریاست ''Autonomy'' کے لئے British استعماری (Colonial) کی مخالفت اور جاپان کی مدد کرنی ہے۔

(۲) ہندستانی عوام اور انگریزوں کو باہر نکالنا ہے۔

(۳) روہنگیا اور Kamans کے مسلمانوں کو ان کی جگہ پر روک کے رکھنا ہے تا کہ ان کا بھی بعد میں صفایا کر سکیں۔

ان منصوبوں کے تحت Thakin پارٹی کے لیڈروں نے مسلمانوں کے قتل عام کا حکم دے دیا۔ ۲۸ مارچ ۱۹۴۲ء میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ مسلمانوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور بڑی بے جگری سے لڑے لیکن بدھسٹوں کے منظّم سخت حملوں اور ان کے ہتھیاروں کے آگے ٹک نہ سکے۔ ہزاروں کی تعداد میں بے گناہ مسلمان مرد، عورتیں، اور بچوں کو قتل کیا گیا۔ گاؤں کے بہت سے مسلمان جان بچانے کے لئے ندی میں کود گئے یا جنگلوں میں چھپ گئے، جو مسلمان زخمی ہوئے ان کو دوبارہ بھالوں سے چھیدا گیا۔ تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا، عورتوں کی عصمت دری کرنے کے بعد ان کو مدت کی نیند سلا دیا گیا۔ ان کے گھروں کو تباہ کر دیا گیا اور جو قیمتی سامان تھا اس کو Thankin کے لٹیروں نے لے لیا اور باقی کو عوام کے حوالے کر دیا۔

تاریخ اس واقعہ کو بیان کرتی ہے:

" The waters of lemro river turned red with the blood of innocent victims" (A history of

(Arakan p. 27
کہ بے گناہ مسلمانوں کے خون سے لمرو ندی کا پانی سرخ ہوگیا۔

اگلے دن ۲۹ مارچ کو ''Lombaissor'' پر حملہ کیا، یہاں روہنگیا مسلمانوں نے بہادری اور دلیری سے مدافعت کرنے کی کوشش کی، لیکن آخر پسپا ہونا پڑا، صرف کچھ لوگ پتھری قلعہ ''Patthari Qilla'' میں اپنی جان بچا کر بھاگ گئے، اور باقی لوگ شہید کر دیے گئے۔

Minbya اور Lambaissor شہر کے Chanbilli گاؤں کو تباہ کرنے کے بعد Myebon شہر میں جو چھوٹی چھوٹی بستیاں تھی ۱۱/اپریل ۱۹۴۲ء میں ان کو بھی اجاڑ دیا۔ صرف ان بستیوں میں ۱۵۰۰۰ مسلمانوں کو قتل کیا گیا اپریل کے آخری ہفتہ تک ۱۰۰۰۰۰ سے زیادہ مسلمان مرد عورتیں اور بچے شہید ہوئے۔ ہزاروں کی تعداد میں گاؤں کو تباہ کیا گیا، مسلمانوں کے تمام وہ علاقے جو کثرت میں تھے اب وہ قلت میں آ گئے۔

Buthidaung پر مسلمانوں کا حملہ:

۱۹۴۲ء میں اپریل کے آخری ہفتہ میں جب بدھسٹ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے جا رہے تھے، اسی بیچ مسلمانوں کو تھوڑا سا موقع ملا اس موقع کو غنیمت جان کر مختلف گاؤں کے مسلمان ایک جھنڈے تلے جمع ہونے لگے، خصوصا اراکان کے وہ مسلمان جو اپنی جان بچا کر چھپ گئے تھے آ کر شامل ہوگئے، اس تھوڑی سی جماعت نے Buthidang شہر کو اپنے گھیرے میں لے لیا، ایک لمبے محاصرے کے بعد خوف زدہ مگھ بدھسٹوں کو یہ یقین ہو چلا کہ اب یہ شہر ہاتھ سے نکل جائے گا اور شکست یقینی ہے، تو نیف ندی کے راستہ سے راہ فرار اختیار کرنی چاہی لیکن راہ فرار اختیار کرنے کے سلسلہ میں مگھ بدھسٹ اور Chines جو وہاں موجود تھے، دونوں میں جنگ چھڑ گئی، دراصل مگھ بدھسٹ چاہتے تھے کہ Chines کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائیں، جس کے نتیجہ میں Chines نے بدھسٹوں کی کئی کشتیوں کو ڈبو دیا۔ اس طرح مسلمانوں نے یکے بعد دیگرے وہ تمام علاقے جن پر بدھسٹوں نے قبضہ کر لیا تھا آزاد کرا کرا اپنے قبضہ میں لے لئے، اور وہاں کے باقی بدھسٹوں نے Naf ندوی کو پار کر کے British کے مقبوضہ علاقے میں پناہ لی۔

جب یہ خبر Thakins اور بدھسٹوں کو پہنچی تو وہ ہواس باختہ ہوگئے، اسی بیچ ایک دوسرا واقعہ پیش آیا۔ Thakin پارٹی کے لیڈر کشتی میں سوار Mayu ندی سے گزرتے ہوئے Buthidang شہر جا رہے تھے، راستہ میں انہوں نے مسلمانوں کو ڈرانے کے لئے ان پر فائرنگ کی، کچھ بہادر مسلمانوں نے ان کو راستہ میں روک لیا، اور ان پر اتنی شدت سے حملہ کیا کہ ان کو واپس ہونا پڑا، اور اراکان کا کمشنر اور اس کے کچھ ساتھی قتل کر دے گئے، اس حادثہ سے بدھسٹ اور جاپانی دونوں بوکھلا گئے۔ اب ان کو اندازہ ہوگیا کہ مسلمانوں کو شامل کئے بغیر برما کے وہ علاقے جو ابھی تک انگریزوں کے قبضہ میں تھے ان پر مکمل قبضہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے جاپان نے ایک میٹنگ کی جس میں مسلم اور بدھ دونوں طرف سے نمائندوں کو مدعو کیا، اس سے قبل کہ کسی نقطہ پر پہونچتے کوئی لائحہ عمل طے کرتے بحث ومباحثہ میں دونوں کے بیچ جنگ شروع ہوگئی، جس میں دونوں طرف کے اچھے خاصے لوگ مارے گئے۔

انگریزوں کا اراکان میں دوبارہ داخلہ:

جاپان کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر انگریزوں کو خطرہ لاحق ہوا، اس لئے جاپانی فوج کو اراکان میں ہی روکنے کے

ارادہ سے ایک ''V Force'' تیار کی جس میں اراکان کے ۹۹ فیصد مسلمانوں کی بھرتی کی اور انہیں لڑنے کی ٹریننگ بھی دی۔ مسلمانوں نے جاپان کے خلاف انگریزوں کا پورا ساتھ دیا اور بہت سے مسلمان شہید بھی ہوئے۔

انگریزوں کا ساتھ دینے میں مسلمانوں کے پیش نظر دو بڑی جوہات تھیں:

(ا) ایک تو جاپانی مسلمانوں کے دشمنوں کے دوست تھے، (۲) دوسرے انگریزوں نے اراکان کو خودمختار ریاست کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ میں دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن افسوس انگریزوں نے مسلمانوں کو صرف ''Milking cow'' کی طرح استعمال کیا۔ مسلمانوں کو ان کی بے بہا قربانیوں کے نتیجہ میں جوصلہ دیا وہ آج ظاہر اور آنکھوں کے سامنے ہے۔

اراکان برما کی مکمل آزادی کے وقت:

۱۹۴۵ء میں جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد برما کی آزادی کی لہر زور شور سے پورے ملک میں دوڑ گئی۔ British حکومت سے یہ معاہدہ کیا گیا کہ برما کی آزادی Altantic Charter کے مطابق ہوگی، پھر لندن میں ۲۷ جنوری ۱۹۴۷ء کو Atlee Aung Sun Agreement پر اس شرط کے ساتھ دستخط کیے گئے کہ ایک سال میں برما کو مکمل آزادی حاصل ہوجائے گی اور Constituent Assembly کو عمل میں لانے کے لئے چار مہینہ کے اندر ہی ایک انتخابی چناؤ کیا جائے گا۔ لیکن اراکان کے مسلمانوں کا صفایا کرنے کے لئے اراکان کی تقدیر کا فیصلہ تعصب پرست مگھ بدھسٹوں نے برما کے لٹیروں کے ہاتھ سونپ دیا، دوسری طرف مسلم لیڈروں نے بھی تمام مسلمانوں کو متحد کرنا شروع کردیا۔

''برما کی آزادی کا وقت قریب ہورہا تھا، برما کے مسلم لیڈروں کی مستقبل کی سیاسی حکمت عملی کے سلسلہ میں ان کی رائے مختلف ہورہی تھی۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں نے ۲۴ تا ۲۶ دسمبر ۱۹۴۵ء میں Pyinmana مقام پر All Burma Muslim Conference منعقد کی جس میں تمام مسلم جماعتوں کو متحد کر کے صرف ایک جماعت بنائی گئی، جس کا نام The Burma Muslim Congress رکھا گیا''۔ (بحوالہ The Muslim of Burma by M.Y egar P.75)

پھر BMC نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی نمائندگی انفرادی طور پر کسی بھی تنظیم کی طرف سے نہیں کی جائے گی جبکہ General Council of Burma Mslim Association (GCMA) کی رائے اس سے مختلف تھی (The Muslims of Arakan p.75)۔

ایک طرف اراکان کے روہنگیا مسلمانوں نے اپنی موجودہ صورت حال اور تاریخی پس منظر کی وجہ سے برٹش حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو علحدہ قومیت تسلیم کر کے علاقائی خودمختار ریاست کے طور پر قبول کیا جائے۔ اسی امید کے پیش نظر روہنگیا مسلمانوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف برما کے تمام لوگوں نے اپنے اپنے علاقوں کی یا تو پوری آزادی یا آزاد ریاست کا مطالبہ کیا۔ لیکن برٹش حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کو علیحدہ قومیت تسلیم کر کے علاقائی خودمختار ریاست کے طور پر قبول کیا جائے، لیکن برٹش حکومت نے آزادی کا پروانہ دینے سے قبل (Aung San) سے شرط لازم کے طور پر برما کی پوری قومیت کی رضامندی کا مطالبہ کیا۔

اسی مقصد کے پیش نظر Aung San نے پورے ملک کا دورہ کیا مختلف سربراہوں سے ملاقات کی اور اس معاملہ میں

تبادلۂ خیال کیا، اور باقی لوگوں سے مکمل آزادی اور تحفظ کا وعدہ کیا۔ Unity in Diversity کے فارمولہ کے تحت مذہبی اور ثقافتی تحفظ کی بقا کی ذمہ داری لی۔ لیکن سرحدی لوگ ''Frontier Peoples'' ان تمام شرائط سے غیر مطمئن تھے۔

مارچ ۱۹۴۶ء میں Aung San نے Akyab کا دورہ کیا، اور مسلم قائدین کو ان کے حقوق کی یقین دہانی کرائی، اور مختلف جگہوں پر نمائندوں کو بھیج کر مسلمانوں کو AFPFL میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ لیکن مسلمانوں نے Aung San کی تنظیم AFPEL میں شامل ہونے سے انکار کردیا۔

بالآخر فروری ۱۹۴۷ء میں ایک تاریخی Fang Long Conference منعقد ہوئی۔ اراکان کے روہنگیا مسلمانوں کے علاوہ تمام نمائندوں کو کانفرنس میں آنے کی دعوت دی گئی، جبکہ اراکان کی نمائندگی کے لئے ایک مگھ بدھسٹ U Aung Zan wai کو مدعو کیا۔ جس میں تمام نمائندوں نے اپنے اپنے حقوق کے لئے پرزور طریقہ سے بحث ومباحثہ کیا، لیکن اراکان کا نمائندہ بالکل خاموش تماشائی بنا بیٹھا رہا، جس کے نتیجہ میں اراکان سنٹرل گورنمنٹ کی ماتحتی میں آ گیا، اس طرح روہنگیا مسلمانوں کو Political Process سے بالکل الگ کردیا گیا۔ British حکومت بھی اس پر خاموش رہی۔

اس کے بعد روہنگیا مسلمانوں نے قائداعظم محمد علی جناح (جو اس وقت پاکستان کی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے) کے پاس ایک نمائندہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

''۱۹۴۷ء میں مسلم نمائندے Maungdau سے قاعد اعظم محمد علی جناح سے ملاقات کے لئے روانہ ہوگئے، ان لوگوں نے محمد علی جناح سے درخواست کی کہ یا تو جنگ کرکے شمالی اراکان کو پاکستان میں شامل کرلیں یا پھر برمی لیڈروں پر دباؤ ڈالیں کہ وہ شمالی اراکان کو مسلمانوں کے حق میں آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کریں بحوالہ'' The Muslims of Burma p. 75 '' مسلم نمائندوں کے ملنے سے پہلے Aung San کا ایک خاص سفارتی نمائندہ مسٹر راشد جو ہندوستانی مہاجر تھا پہلے ہی قاعداعظم سے مل چکا تھا۔ اس نے قاعداعظم کو'' Aung San کی طرف سے یہ یقین دلایا کہ آئینی طور پر اراکانی مسلموں کو پورا پورا حق دیا جائے گا۔ جس کی وجہ سے قاعداعظم نے مسلم نمائندہ کو تسلی دے کر واپس کردیا۔

Pang Long Conference کے بعد اپریل ۱۹۴۷ء میں ملکی پیمانہ پر Constituent Assembly کے عام انتخابات ہوئے لیکن جان بوجھ کر شمالی اراکان میں انتخابات عامہ نہیں کرائے گئے، اور جب برما کا پہلا آئین تیار ہوا اس میں بھی اراکانی مسلمانوں کو شریک نہیں کیا گیا۔

اراکان کو ریاست کا درجہ نہ دینے کی وجہ:

برما کی آزادی کے بعد قانوناً اکثر علاقوں کو ریاست اور باقی کو Special Devision کا درجہ دیا گیا، اراکان جو کہ قانوناً پورا مستحق تھا کہ اس کو ریاست'' State'' کا درجہ دیا جاتا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد یونس اپنی کتاب A History of Arakan میں لکھتے ہیں:

''دراصل Aung san اور اراکانی بدھسٹوں کے بیچ پہلے ہی سے ایک خفیہ معاہدہ ہوگیا تھا کہ اراکانی بدھسٹ ریاست کا مطالعہ اس وقت تک نہیں کریں گے، جب تک کہ مسلم مسائل کو حل نہ کرلیا جائے، اس لئے کہ اراکان میں مسلم

اکثریت کا موجود ہونا برمی اور اراکان بدھسٹ دونوں کے لئے اہم مسئلہ تھا، انہوں نے محسوس کیا کہ اگر مسلم مسئلہ کو حل کئے بغیر اراکان کو ریاست کا درجہ دے دیا گیا تو یہ ان کے مفاد کے خلاف ہوگا مزید انہوں نے مسلم اکثریت کو کم کرنے کی تمام کوششوں کو بروئے کار لانے کا فیصلہ بھی کیا''۔

اس عبارت سے ان کے چھپے ہوئے عزائم کا صاف پتہ چلتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اراکان کی مسلم اکثریت کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ کیا۔

اسی مقصد کے تحت ۱۹۴۲ء کے فساد میں تقریبا ۱۰۰۰۰۰ مسلمانوں کا قتل کیا، اور قانون سازی کے وقت جان بوجھ کر روہنگیا مسلمانوں کو الگ رکھا، ۱۹۳۱ سے ۱۹۳۲ تک لندن میں منعقد ہونے والی BRTC میں روہنگیا مسلم نمائندہ کو مدعو نہیں کیا گیا، اور PLC کے بحث ومباحثہ میں بھی اراکانی نمائندہ Mr. Twn Aung Gyaw خاموش بیٹھا رہا۔

حکومت کے خلاف بغاوت:

''آزادی کے بعد AFPFL یعنی Anti Fascist Freedom League کی نظام حکومت نے بہت سے مسلم Officers اور Officials کو نوکری سے برخواست کر کے ان کی جگہ اراکان بدھسٹوں کو مقرر کر دیا، مسلم جماعتوں کو بہت زیادہ پریشان کرنے لگے، ان کے خلاف تفریق سے کام لیتے، چھوٹے بچوں سے ان کا مذاق اڑوائے اور ان کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کرتے ساتھ ہی Maungdaw علاقہ سے لے کر Akyab تک کی تمام مسلم تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی، اور ہزاروں وہ مسلمان جو ۱۹۴۲ء کے فساد میں ہندستان چلے گئے تھے ان کو واپس ہونے کی اجازت نہیں دی، بلکہ ان کی تمام جائیداد کو ضبط کر لیا گیا۔ بحوالہ''The Muslim of Burma p.102''

ابھی تک ۱۹۴۲ء کے فساد کے زخم ہرے نہیں ہوئے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں حکومت نے مسلمانوں کے ساتھ دہرا رویہ اختیار کر کے مزید ان کے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ اور اب مسلمانوں کی بقا اور ان کی سالمیت کو بہت بڑا خطرہ تھا۔

اس اضطرابی کیفیت میں حقوق کے مطالبہ کے لئے بقیہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو Reorganise کرنا شروع کر دیا جن کی قیادت محمد جافر (جن کو جافر قوّال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کر رہے تھے۔ آپ نے علامہ اقبال کی شاعری کی مدت سے مجاہدین میں ایک ایسی روح پھونک دی کہ وہ اپنے ایمان کی سالمیت اور عزت وعظمت کی بقا کی خاطر اپنی جان و مال کو قربان کرنے پر دل وجان سے آمادہ ہو گئے۔ دوسری طرف برمی اور اراکانی بدھسٹوں نے اپنے اندرونی معاملات کو نپٹایا حکومتی نظم ونسق کو مستحکم کیا، اور مسلمانوں کو بالکل wipe out کرنے کے لئے آئندہ کی خارجی اور داخلی پالیسی از سر نو ترتیب دی۔ اور مسلمانوں کو کس طرح دوسرے کاموں میں الجھا کے رکھنا ہے یہ بھی طے کیا۔ اسی طرح ۱۹۴۹ء تک مسلم مجاہدین اور حکومتی فوج کے درمیان کسی قسم کا encounter نہیں ہوا لیکن ۱۹۴۹ء کے آخر میں روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ جو ایک طرفہ بڑا حادثہ ہوا اس سے مسلمانوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ دراصل برمی حکومت نے سرحدوں کی حفاظت کے بہانے ایک'' Burma territorial force'' (BTF) تیار کی جس میں اراکان کے ۹۰ فیصد بدھسٹ شامل تھے جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے پھر BTF نے Akyab کے ڈپٹی کمشنر Kyawu کی ماتحتی میں شمالی اراکان میں دہشت کی ہوا چلا کر مسلم مرد عورتوں اور بچوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جس میں سینکڑوں دانشور، گاؤں کے نوجوان اور علماء کو بری طرح قتل کیا۔ اور گھروں کو منہدم اور نذر

آتش کر دیا جبکہ ۵۰۰۰۰ لوگ مشرقی پاکستان چلے گئے۔ اس اچانک پیش آنے والے حادثہ نے مسلمانوں کو سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دیا۔

بالآخر مجاہدین کی جماعت جن کی قیادت محمد جافر کر رہے تھے۔ انہوں نے پہلے تو حکومت سے قانونی طور پر اپنے حقوق اور انصاف کا مطالبہ کیا۔ لیکن جب حکومت نے خاموشی اختیار کی تو حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور آناً فاناً ان تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا جو ان سے چھین لئے گئے تھے، مجاہدین کا حملہ جنگل میں لگی ہوئی آگ کی مانند تھا، دوسری طرف برمی حکومت بہت مشکل سے کچھ پولس چوکیوں کو صرف واپس لینے میں کامیاب ہوئی، جب حکومت نے دیکھا کہ حالات پر قابو پانا بہت مشکل ہے تو بہت ہوشیاری سے ایک چال چلی، وہ چال یہ تھی کہ:

"On 25th Sept. 1954 at 8:00p.m., the then prime minister of Burma UNU in this radio speech to the nation declared Rohingya as an indigeuous ethinic community"

بحوالہ (the Muslims of Burma p.96)

پرائم منسٹر UNU نے گویا کہ مسلمانوں کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی۔ اور ان تمام حقوق کا اعلان کر دیا جن کو مسلمان چاہتے تھے۔ جب مسلم عوام نے یہ دیکھا کہ ہمیں تو وہ سارے حقوق مل رہے ہیں، اس جال میں پھنس کر مسلم عوام نے سمجھا کہ اب حکومت سے لڑنا فضول ہے تو انہوں نے مجاہدین کا ساتھ چھوڑ دیا جس کی وجہ سے مجاہدین اپنے ہی لوگوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کا حکومت نے پورا فائدہ اٹھا کر مسلم عوام سے ہمدردی ظاہر کی اور ان کو ساتھ لیا، ساتھ ہی ساتھ مجاہدین کے خلاف ایک مشن تیار کیا جس کا نام ”Operation Monsoon“ رکھا اس کے لئے ایک Volunteer Force تیار کی جس نے بہت سے مجاہدین کو گرفتار کر کے قید کر دیا اور اکثر کو قتل کر دیا۔ اور مقامی مسلمانوں کی مدد سے مجاہدین کے گھروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ مسلم عوام سے مزید ہمدردی ظاہر کرنے کے لئے ۱۹۵۹ء میں وزیر اعظم UNU اور وزیر دفاع U Ba Swe نے Buthidung اور Maungdow شہروں کا دورہ کیا اور اپنی قیادت میں سیاسی بڑی ریلیاں نکلوائیں جس میں روہنگیا مسلمانوں کو تمام شہری حقوق دینے اور نسلی خودمختار ریاست کی حیثیت سے تسلیم کرنے کا اعلان کیا، اس طرح حکومت نے ۱۹۶۱ء کے اخیر تک مجاہدین کی بے قابو بغاوت پر مکمل قابو پالیا، لیکن افسوس یہ صرف ایک سیاسی مکر وفریب اور حکومتی ڈرامہ تھا جس کو مسلمان صحیح سمجھ بیٹھے۔ اس طرح ۱۹۶۲ء تک روہنگیا مسلمانوں کو سیاسی جال میں پھنسا کے رکھا گیا، برمی حکومت صرف ان کو خواب دکھاتی رہی۔ دوسری طرف مسلمان بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر خواب وعقلیت میں زندگی گزارتے رہے۔

۱۹۶۲ء تک مسلمان اس کنڈیشن میں تھے کہ اپنا دفاع وہ خود کر سکیں بلکہ ایسے مواقع پر انہوں نے بے سروسامانی کے باوجود اپنا دفاع بھی کیا، لیکن ۱۹۶۲ سے ۲۰۱۶ کے فوجی آپریشن تک مسلمانوں کے ساتھ برمی حکومت اور کچھ ممالک نے مل کر اپنے ذاتی مفاد کی خاطر جو ذلت آمیز کھیل رچا، وہ یقیناً ایسا ہے کہ سنگ دل انسان کا بھی دل پگھل جائے، اس کی راتوں کی نیند اڑ جائے اور دن کا سکون غارت ہو جائے۔

(......**جاری**)

☆☆☆

□ چشم کشا

مدارس سے باصلاحیت افراد کیسے مل سکتے ہیں؟

مولانا محمد سالم قاسمی (مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند)
ترتیب وپیشکش: محمد قمر الزماں ندوی

آج کل مدارس اسلامیہ کے بارے میں عام احساس یہی ہے کہ مدارس دینیہ میں تعلیم پانے والی بڑی تعداد، علوم اسلامیہ اور مقررہ نصابی کتابوں میں مہارت ولیاقت پیدا نہیں کر پاتی۔ اعلیٰ صلاحیت ولیاقت اور استعداد وقابلیت تو دور کی بات ہے، ادنی مناسبت بھی ان علوم وفنون سے نہیں ہو پاتی، اور کہنے والے تو یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ مدارس دینیہ کی کوکھیں اب بانجھ پن کا شکار ہوگئی ہیں۔ اس جملہ کو ہم مبالغہ پر محمول کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج مدارس دینیہ جو دین کے قلعے ہیں وہاں انتظامیہ اور ارباب اہتمام مدارس سے وابستہ ہونے والوں کی دماغی کیفیت اور فطری لیاقت کا جائزہ لئے بغیر، سب کے ساتھ یکساں سلوک کر رہے ہیں، جس کا ناخوشگوار نتیجہ ہم کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ ان کے وسائل، قربانیوں اور مجاہدات کا ایک بڑا حصہ ضائع اور بیکار ہو رہا ہے، اس سلسلے میں غور وفکر کر کے ایک مضبوط، مستحکم اور مفید وموثر نصاب اور نظام تعلیم مرتب کرنا اور اس کا خاکہ مرتب کر کے اس کو نافذ کرنا آج وقت کی بڑی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں راقم السطور کے پاس اساطین علماء کرام اور دانشوران ملت کی کچھ مفید تحریریں، خاکے اور منصوبے ہیں جو ہم آپ کی خدمت میں وقفے وقفے سے پیش کریں گے، اس امید کے ساتھ کہ آپ حضرات بھی ان تحریروں کو غور وفکر کے ساتھ پڑھیں گے اور اس کے نفاذ کی کوشش اپنے اپنے اداروں میں حتی الوسع کریں گے۔ آج آپ کی خدمت میں بقیۃ السلف خطیب العصر حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی دامت برکاتہم کی اس موضوع پر ایک انتہائی مفید اور جامع تحریر پیش کر رہے ہیں۔ حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی جو کہ بلاشبہ مدرسہ کے حوالہ سے "صاحب البيت أدرى بما فيه" کے مصداق ہیں۔ مولانا کی یہ تحریر اس موضوع پر ہم حرف آخر تو نہیں کہہ سکتے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب تک اس سلسلے میں میری نظر سے جو تحریریں گزری ہیں ان میں سب سے زیادہ مفید اور جامع تحریر اور قیمتی رائے ہے، نیز تسلی بخش حل ہے۔ ضرورت ہے کہ مدارس کے ذمہ داران اس تسلی بخش حل پر غور کریں اور اس تجویز اور نظام تعلیم پر عمل کر کے مدارس کی افادیت کو دوبالا کریں، اگر اس پر عمل ہو جائے تو مدارس دینیہ سے معاشرے کو باصلاحیت افراد آسانی سے مل سکتے ہیں۔ مولانا محترم کی بیش قیمت اور گراں قدر تحریر ملاحظہ کیجئے:

مولانا تحریر فرماتے ہیں: ''اگر ہم ان تنقیدوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں تو مدارس کے تعلیمی تدریسی طریقۂ کار میں کچھ اصلاحات ناگزیر ہیں۔ اصولی طور پر ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ایک ہی نصاب تمام طلبہ کو پڑھانا نافع ومفید نہیں ہے، کیوں کہ مکمل عربی نصاب کی تدریس کے لائق جو طلبہ مدارس کا رخ کرتے ہیں ان میں بہ مشکل ۷ سے ۱۰ فیصد ایسے طلبہ پائے جاتے ہیں کہ اگر ان کو اساتذہ کی توجہ وعنایت حاصل ہو، تو وہ آج بھی دیدہ ور ہو کر زمانہ کے چیلنج کو قبول کر سکتے ہیں۔ یہ طلبہ ذہین ہونے کے ساتھ علوم اسلامیہ کی طرف طبعی رجحان رکھتے ہیں۔ مدارس میں پڑھنا ان کی اپنی پسند و

ترجیح ہوتی ہے، وہ کسی دباؤ میں آکر مدرسہ کا رخ نہیں کرتے۔اس لئے ارباب مدارس ایسے طلبہ کی دریافت وشناخت کریں، اوران کو سرمایہ سمجھیں، ان کی تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دیں، ان کے لئے وسائل علم مہیا کریں، ان کی صلاحتیوں کو پروان چڑھائیں، محنت وجفاکشی کی بھٹی پر تپائیں، کندن بنائیں، ان میں سے مفسر، محدث، فقیہ، ادیب، خطیب، متکلم، مؤرخ وسیرت نگار اور علوم اسلامیہ کے ہر فن کے حاذق وماہر پیدا ہوں گے، جو دعوت وعزیمت کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیں گے۔ملت اسلامیہ ہند کی آبیاری کے لئے ہراول دستہ ثابت ہوں گے اور بحیثیت جماعت تجدیدی کارنامے انجام دیں گے، لیظهره علی الدین کله کی عملی تفسیر بنیں گے۔طلباء کی دوسری قسم مدارس میں وہ ہے جو ذہین وفطین تو ہے۔

لیکن مدارس میں پڑھنا ان کا اپنا فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ والدین اور سرپرستوں کا دینی ذوق انہیں دین پڑھنے پر مجبور کرتا ہے، اور وہ مدارس کی زندگی دباؤ میں رہ کر گزارتے ہیں، تجزیاتی مطالعہ کے مطابق ایسے طلباء کی تعداد ۲۵ سے ۳۰ فیصد پائی جاتی ہے۔ان طلباء کو مدارس کا مکمل نصاب پڑھانا ان کے اوپر بوجھ مسلط کرنا اور ان کے وقت کو ضائع کرنا ہے۔ ان کے لئے ایک مختصر عربی نصاب چارسالہ تیار کیا جائے، تاکہ کم وقت میں ان طلباء کی فکری تربیت کے ساتھ علوم اسلامیہ سے یک گونہ مناسبت پیدا کی جاسکے، جس سے ان کی آئندہ زندگی پر دین کی چھاپ ہو اور وہ چاہیں تو اپنے طبعی ذوق کے مطابق علوم عصریہ کی تکمیل یونیورسٹیوں میں کرسکیں، یا طبیب وڈاکٹر بن سکیں، البتہ اس طبقہ کے اندر دعوتی روح پھونکی جائے تاکہ معاشرہ کی اصلاح میں اہم رول ادا کرسکے۔

مدارس کے طلباء کی تیسری بڑی تعداد ایسی ہوتی ہے، جو نہ ذہین ہوتی ہے اور نہ اس کے اندر علوم حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔معاشی مجبوری، والدین کی خواہش، معاشرہ کے دباؤ میں آکر مداس کا رخ مقصد سے بے نیاز ہوکر کرتی ہے، اور یہ تعداد ۵۰ سے ۶۰ فیصد تک پہنچ جاتی ہے۔ان طلباء کو مدارس کا مکمل نصاب پڑھانا وسائل کا ضائع کرنا اور دینی علوم کے اعتبار کو کم کرنا ہے۔کیوں کہ باوجود کوشش کے ان طلباء کا نصابی کتب سمجھنا اور کچھ حاصل کرنا ناممکن ہے، یہ طلباء رعایتی نمبروں سے ترقی کرتے کرتے فارغ ہوجاتے ہیں اور سند فراغت کا استحقاق بغیر حق کے پیدا کرلیتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں علم سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوپاتا ہے۔لوگ انہیں عالم سمجھ کر ان سے مسائل کا حل چاہتے ہیں، تو یہ دامن بچاتے ہیں یا غلط رہنمائی کرتے ہیں اور بجائے نیک نامی کے بدنامی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ایسے طلباء کے لئے ہلکا آسان وچست نصاب اردو میں تیار کیا جائے جس میں قرآن کریم کی تصحیح اور حفظ، عام مسائل دین، تاریخ اسلام، حساب، انگریزی اور اردو زبان کی تعلیم کا نظام ہو، مزید مختلف محاضرات کے ذریعہ ان کی فکری تربیت کی جائے، تاکہ یہ علاقائی مکاتب، قصبات اور ان کے مضافات کی مساجد میں موذنی وامامت اور تدریس کے فرائض انجام دے سکیں۔نہ ان کا وقت ضائع ہو اور نہ مدارس کے وسائل کا غلط استعمال ہو اور نہ لوگ ان کے بارے میں غلط فہمی کے شکار ہوں۔ ہمارے علم کے مطابق کہیں کہیں اس طرز کا اردو نصاب شروع بھی ہوچکا ہے۔اگر اس طرز تعلیم کو رائج کریں تو ہر سال علماء کی ایک ایسی جماعت-خواہ مختصر ہی کیوں نہ ہو- پیدا ہوگی جو علوم دینیہ میں راسخ، نبوی اخلاق وکردار کی آئینہ دار، حکمت وموعظت کا مثالی نمونہ، امت کے لئے مثل باران رحمت ثابت ہوگی، جو دلوں کو تڑپانے، روحوں کو گرمانے، دماغوں کو علمی تابنا کیوں سے منور کرنے میں علماء کبار اور اسلاف کی یاد تازہ کرے گی۔(ماہنامہ نوائے ہادی، اگست ۲۰۰۶ء)

☆☆☆

لائحہ عمل

مالداروں اور مدارس کے ذمہ داروں سے چند گزارشات

محمد قمر الزماں ندوی (جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی)

دینی مدارس اسلام کے قلعے ہیں، یہ مسلمانوں کے لئے پاور ہاوس اور بجلی گھر کی حیثیت رکھتے ہیں، پوری دنیا میں اور خاص طور پر برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کی شناخت زیادہ تر مدارس کی وجہ سے ہے۔ اسلامی شعار کی حفاظت، اور عائلی نظام کے وجود و بقا میں مدارس کا کردار کسی سے مخفی اور پوشیدہ نہیں، آج اگر اسلامی معاشرہ میں دینی رمق اور ایمان کی کچھ حرکت اور حرارت باقی ہے تو یہ فیض اور احسان ہے انہی مدارس کا، اور باطل کو سب سے زیادہ ڈر اور خطرہ بھی انہی مدارس سے ہے کیونکہ اسے علم ہے کہ اسکے سارے منصوبے مدارس اور وہاں کے فارغین اور فیض یافتہ افراد کی وجہ سے ناکام ہو جاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بالکل سچ کہا ہے:

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ وبالا

مدارس کی اہمیت اور اس کی ضرورت کے سب قائل ہیں سوائے چند بے توفیق لوگوں کے جو آئے دن مدارس کے خلاف اور وہاں کے نظام کے خلاف بے جا تبصرہ کرتے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کے خوشحال طبقہ میں بھی ان لوگوں کی خاصی تعداد ہے جو اپنے قول و عمل سے دین کی ضرورت، اہمیت، اور برکت کے قائل اور معترف ہیں۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ علم دین کے فروغ و بقا اور ترویج و اشاعت کے لئے مدارس اسلامیہ کی دامے درمے مدد تو کرتا ہے مگر اس طبقہ کو اس سعادت کی توفیق کم ہی ملتی ہے کہ وہ اپنی تمام اولاد کو نہ سہی، بعض ہی کو علم دین کے لئے وقف کر دے اور ان کو عالم دین، مبلغ اور داعی اسلام بنائے، راقم السطور کی فکر، سوچ اور خیال یہ ہے کہ دین کے موثر با کمال اور جاندار ترجمان اور داعی و مبلغ پیدا کرنے کیلئے دینی مدارس، جامعات اور درسگاہوں میں خاصی تعداد میں ان حضرات کا اپنی اولاد کو تعلیم دلانا ضروری ہے جنہیں اللہ تعالی نے خوشحال اور صاحب ثروت بنایا ہے جو تجارت، زراعت، سرکاری یا نیم سرکاری اداروں میں ملازمت یا کسی جائز ذریعہ سے اپنی اولاد کے لئے رزق حلال کی ایسی سبیل اور ذریعہ رکھتے ہیں جو انہیں سرکاری اداروں میں ملازمت اور کالج یونیورسٹی سے مستغنی کر دے۔

میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں اور الحمدللہ مدرسہ میں بائیس سالہ تدریسی خدمت، تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر اس رائے اور خیال کا اظہار کر رہا ہوں کہ اگر معاشرے کے مالی اعتبار سے خوشحال، سربرآوردہ، زمانہ شناس اور مدنیت آشنا اور واقف طبقہ کے نونہال اور نوجوان دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہوں تو اسلام کو اور دین و علم کو ایسے ترجمان، داعی و مبلغ اور خادم مل جائیں گے جو ید علیا، بلند نظری، وسیع القلبی اور خودداری و خوداعتمادی کی اعلی صفات سے آراستہ ہو کر دین اور علم دین کی خدمت و اشاعت بحسن وخوبی انجام دیں گے، قوم ان کی رہنمائی کی ہر لحہ محتاج ہوگی، وہ قوم وملت کے دست نگر اور محتاج نہ ہوں گے۔ الحمدللہ مسلمانوں میں ایسے علماء بھی ہیں جو اصحاب ثروت گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اور پوری خوداعتمادی اور بلند نظری کے ساتھ علمی تحقیقی اور دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں؛ لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے یا وہ صفر کے درجے میں ہے۔

بعض مالدار اور خوشحال حضرات کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے بچوں کی شرارتوں یا ذہنی دماغی کمزوری اور پڑھنے میں عدم دلچسپی سے عاجز اور تنگ آ کر انہیں لئے ہوئے دینی درسگاہوں کا رخ کرتے ہیں گو کہ وہ ایسا کرنے میں اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ بچوں کے اخلاق وکردار کی درستی اور عقل وشعور کی پختگی صحیح معنی میں دینی درسگاہوں

میں ہی حاصل ہوتی ہے مگر یہ طرزِ عمل اچھا نہیں ہے۔ میری نگرانی میں ابھی ایک بچہ ایسا ہے جو دماغی اور ذہنی طور پر کمزور ہے، اس کے والد نے اپنے دوسرے تمام بچوں کو اسکول اور کالج و یونیورسٹی میں اعلی تعلیم دلائی اور اس معذور بچے کو یہ کہہ کر میرے مدرسہ میں داخل کروایا کہ ہم اس کو عالم اور داعی و مبلغ بنانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے دھوکہ میں رکھ کر داخلہ کے لئے مدرسہ میں بھیج دیا اور یہ بھی نہیں بتایا کہ بچہ ذہنی و دماغی طور پر کمزور ہے، یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بچہ ایسا ہے، میں نے اس شخص کو سخت سست کہا اور یہ سمجھ کر اس بچہ کی نگرانی اور سرپرستی قبول کر لی کہ بعید نہیں کہ اللہ تعالی مدرسہ کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے اسے ہر اعتبار سے صحت مند کردے اور آخرت میں وہ میرے اور میرے اہل وعیال کے لئے ذریعہ نجات بن جائے۔ وہ صاحب خرچ میں تو کوئی کمی نہیں کرتے لیکن جو طریقہ انہوں اختیار کیا اس سے مجھے تکلیف ہوئی۔ میں تو ایسے حضرات سے عرض کروں گا کہ وہ بچوں کی شرارتوں اور ذہنی و دماغی کمزوریوں سے عاجز آ کر بادل ناخواستہ نہیں؛ بلکہ دینی قدروں اور اس کی رفعتوں سے متاثر ہو کر دل کی پوری آمادگی کے ساتھ اپنی اولادوں کو دینی مدارس و جامعات اور درسگاہوں میں داخل کریں اور پھر اس کے بہتر اعلی اور مثبت نتائج کا انتظار کریں۔

اس سلسلے میں ہم دینی درسگاہوں کے ارباب حل وعقد، ارباب اہتمام اور انتظامیہ سے عرض کریں گے کہ آپ اپنے حلقہ اثر کے مالداروں اور اپنے عقیدت مند خوشحال مسلمانوں کو ان کی اولاد کی دینی تعلیم کی دعوت و ترغیب دیں اور مالی اعانت کے حصول سے زیادہ دعوتِ حصول علم کو اہمیت دیں اور ایسے حضرات کی کشش کے لئے تعلیم و تربیت کا بہتر معیار قائم کریں۔ ماہرین تعلیم جن کی قدیم صالح اور جدید نافع پر گہری نظر ہو ان کی نگرانی میں عصر حاضر کی رعایت کرتے ہوئے نصاب تعلیم تیار کریں اور ماہر اساتذہ کی خدمات حاصل کریں اور ان کو اتنی معیاری تنخواہ دیں کہ وہ پورے طور پر یکسو ہو کر بچوں کو تعلیم دیں، اس کے ساتھ ساتھ قیام وطعام کا اعلی سے اعلی نظم کریں، نیز عمومی نظم ونسق میں حسن وخوبی اور سلیقہ وقرینہ کا اظہار کریں تو بعید نہیں کہ دینی مدارس کو مستطیع اور بامقصد وبا شعور طلباء کی ایک تعداد میسر آ جائے گی۔

ہندوستان کے سارے مدارس کو تو اس نہج اور معیار پر نہیں لایا جاسکتا؛ لیکن کچھ مدارس تو اس نہج اور معیار پر چلائے اور کھولے جاسکتے ہیں۔

الحمدللہ حالیہ برسوں میں اس طرح کی کچھ کوششیں ہندوستان میں کی گئی ہیں، جس کے بہتر اور مثبت نتائج آرہے ہیں، اس سلسلے میں مدرسہ نورالاسلام کنڈہ پرتاپ گڑھ میں بھی جہاں خاکسار تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے پیش رفت ہوئی ہے اور اس کے بہتر نتائج سامنے آئے ہیں۔

اگر ہم اس طرح کے کچھ معیاری مدارس اور جامعات قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مستقبل میں علماء کی وہ جماعت تیار ہوگی جن کا ذکر ملت کی علمی تاریخ کا زریں ورق ہے۔ اور بقول مولانا محمد رضوان القاسمیؒ جو تاجر تھے، اہل حرفہ تھے مگر ان میں سے ہر ایک علم ودین کا مرکز ومرجع فی سبیل اللہ، اس کی ترویج واشاعت کے جذبے سے سرشار، وقت کے بادشاہوں اور حاکموں سے بے نیاز اور حق گو وبے باکی کا نمونہ تھا، ضرورت مندوں کو اپنی طرف سے بخشش وعطا اور داد ودہش علمائے سلف کا شعار تھا، یہ امام ابوحنیفہ رح کا علم وعمل تھا جو امت کو قاضی ابو یوسفؒ جیسا فقیہہ اور کتاب الخراج جیسی کتاب عطا کرنے کا ذریعہ بنا۔

غرباء کے دم سے دین قائم ہے، یہ بات اپنی جگہ بجا... مگر... قابل تحسین، اطمینان بخش اور آخرت کی جواب دہی سے نجات دینے والی نہیں......آخرت میں نعمتوں کے متعلق پرسش ہوگی (ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم) مال اللہ تعالی کی نعمت ہے، اس کا وہ انفاق واستعمال جو آبداآلآباد تک صدقۂ جاریہ، اصلاح امت کا ذریعہ اور آئندہ نسلوں کی فلاح ونجات کا وسیلہ بنے وہ یہ ہے کہ اصحاب ثروت اپنی اولاد کو علمائے دین کے اس گروہ میں شریک کریں، جن کا ذکر قرآن مجید میں لیتفقھوا فی الدین (تاکہ دین کے مسائل میں سمجھ بوجھ پیدا کریں) کے تحت آیا ہے''۔

(چراغ راہ از مولانا رضوان القاسمیؒ)

☆☆☆

زبان و ادب

مولوی سید احمد دہلوی

رشید حسن خاں
پیش کش: محمد شعیب ناگپوری

اردو کے مشہور لغت فرہنگِ آصفیہ کے مولف مولوی سید احمد دہلوی کو میں نے دیکھا تو نہیں، اور دیکھتا بھی کیسے، وہ پیدا ہوئے تھے ۱۸۴۶ء میں، یعنی اب سے ایک سو انتالیس برس پہلے اور ۱۹۱۸ء میں اس دنیا سے چلے گئے؛ لیکن میں ان کو جانتا اچھی طرح ہوں، وہ اپنی تحریروں میں اپنے کردار مزاج اور انداز کی رنگارنگی کے ساتھ اس طرح نمایاں نظر آتے ہیں جیسے سامنے موجود ہوں۔ فرہنگ آصفیہ کی پہلی جلد کا جو پرانا ایڈیشن ہے ۱۹۰۸ء کا، اس میں ان کی تصویر بھی شامل ہے۔ بھاری بھرکم بدن، سر پر تُرکی ٹوپی، گلے میں نقش ونگار سے آراستہ مفلر جس کے دونوں سرے اِس طرح ملا کر سامنے رکھے گئے ہیں کہ آرائشی حصہ سامنے آ گیا ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں، چوڑا ماتھا، بھرا ہوا چہرا، اس پر خوش نما داڑھی، جو حدِ اوسط سے تجاوز نہیں کر سکی ہے، داڑھی کے باوجود چہرے پر خشونت کے آثار نہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ بس وہ نام کے مولوی تھے۔ ان کی تصویر اور سادہ صاف تحریریں ان کی بے ریا شخصیت کو اس طرح سامنے لے آتی ہیں کہ اجنبیت کا احساس کم ہو جاتا ہے اور شناسائی کا احساس بڑھ جاتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ آدمی زبان اور ادب کی نسبت سے مولوی صاحب ہی کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہو۔

غلام یزدانی مرحوم سے دلّی والے ناواقف نہ ہونگے، انہوں نے مولوی صاحب سے اپنی ایک ملاقات کا جو حال لکھا ہے اس سے مولوی صاحب کی آخری زمانے کی تصویر بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہے، ملاحظہ ہو:

مولوی صاحب کا حلیہ اور عادات ڈاکٹر جانسن کی شکل وصورت اور خصائل سے ملتے جلتے تھے۔ دونوں کی بصارت کم، دونوں کا مٹاپے کی وجہ سے بے ہنگم جسم۔ مولوی سید احمد کی پلکیں بالکل جھڑ گئی تھیں اور پپوٹوں کے کنارے بالکل سرخ رہتے تھے، پھر بھی مطالعہ اور تصحیح کے کام میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دفعہ میں کسی لفظ کے معنی کی تلاش میں ان کے گھر پہنچا۔ یہ اس زمانے میں ایک پتلی سی گلی میں رہتے تھے، جو شاہ گنج اور شاہ تارا کے درمیان واقع ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے مکان پر جا کر کنڈی کھٹکھٹائی، مولوی صاحب باہر نکل آئے، ننگ دھڑنگ، صرف ایک میلا جانگیا زیب تن تھا، میں نے اپنا مطلب عرض کیا، فرمایا: ذرا ٹھہریے، پھر گھر کے اندر گئے اور کرتا پاجامہ پہن کر اور ایک کنجیوں کا گچھا لے کر باہر آ گئے اور مجھے ساتھ لے کر گلی شاہ تارا کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں ایک لیتھو پریس تھا اور مسوّدات بھی وہیں رہتے تھے۔ مولوی صاحب ایک ڈسک نما میز پر بیٹھ گئے، بستے میں سے مسودہ نکالا، کچھ ورق گردانے

، پھر کلاں نما آئینہ اور اپنی عینک دونوں کی مدد سے میرے پیش کردہ لفظ کے معانی محل استعمال بیان کرنے شروع کیے۔ میں کھڑا سنتا رہا، اور یہ جب تک میری تشفی نہ ہوگئی، سمجھاتے رہے۔ کچھ راہ گیر بھی جمع ہو گئے۔ مولوی صاحب ایک کاٹھ کی کرسی پر بے تکلف بیٹھے ہوئے تھے اور اطمینان اور فراغت کا یہ حال تھا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے پروفیسروں کو اپنے مطالعے کے کمروں میں اتنا ہی سکون حاصل ہوتا ہوگا۔''(مقدمہ رسوم دہلی، طبع کراچی)۔

میں نے ابھی جو مولوی صاحب کی شخصیت کو بے ریا کہا تھا، اس کی تصدیق آپ کو بھی ہوگئی ہوگی۔ زبان کے معاملے میں مولوی صاحب کٹّر دلی والے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ میں جو ادبی اور لسانی چپقلش رہی ہے، اس میں وہ بھی الجھے ہوئے تھے اور اس حد تک کہ ان کا فتوی یہ تھا کہ لکھنؤ والوں کو بھی دلی والوں کی تقلید کرنا چاہیے۔ کیوں کہ دلی سے باہر کا آدمی وہ لکھنؤ کا ہی کیوں نہ ہو، اہل زبان ہو ہی نہیں سکتا۔ انہوں نے لکھا ہے: ''اسی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ دہلی کے سوا کوئی دوسرا شہر ٹکسالی اور مرکز اردو قرار نہیں پا سکتا۔ اردو لکھ لینا اور ہے اور اس کا صحیح لہجہ ادا کرنا اور'' (آصفیہ جلد اول ٦٦) اب آپ کہیں گے کہ کوئی دوسرا شخص کہے تو کہے، ایک لغت نویس کو یہ بات یا ایسی بات نہیں کہنا چاہیے۔ میں اس رائے میں آپ سے متفق ہوں، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اس زمانے میں دبستانی اختلاف نے کچھ ایسی ہی جانب داری کی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ مولوی صاحب نے کوئی نئی بات تو نہیں لکھی، مرزا داغ اس سے پہلے کہہ چکے تھے کہ: ''اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ''۔ یہ تو خیر ایک طرف دار اور ایک فدائی کا نعرہ بے اختیار تھا، لیکن اسی سلسلے میں دو سطروں کے بعد مولوی صاحب نے ایک بہت اہم بات لکھی ہے کہ: ''نیز یہ بھی لحاظ رہے کہ زبان اردو سے صرف الفاظ اردو مراد نہیں، بلکہ لہجہ بھی، جو اس کی اصالت ہے، اسی میں شمار کیا جاتا ہے۔ بس جس شخص کا لہجہ مع الفاظ روز مرّہ درست ہوگا، وہی استاد کامل خیال کیا جائے گا، بلکہ اصل باشندے کا اسی پر اطلاق ہوگا'' یہ نکتہ آج بھی ہماری توجہ کا طلب گار ہے۔

ایک تو مولوی صاحب سچے دلی والے تھے، پھر اردو کا اس وقت تک کا سب سے بڑا لغت مرتب کر رہے تھے۔ ان دو باتوں نے ان کی تحریر میں عجیب صورت پیدا کر دی ہے۔ لغت نویسی کی حد تک ان کا خیال تھا کہ انہوں نے اتنا بڑا کام شروع کیا ہے تو اب کسی اور کو اس میدان میں قدم رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ امیر مینائی نے جب امیر اللّغات کا ایک جز چھاپا تو انہوں نے واضح لفظوں میں امیر پر چوری کا الزام لگایا اور کہا کہ یہ تو میرے ہی لغت کا چربہ اتار لیا ہے۔ فرہنگ آصفیہ کی پہلی جلد کے مقدمے میں بہت ہی سخت اور نامناسب الفاظ میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے اور کہا کہ میں نے آنکھ اور ہاتھ وغیرہ کے جو لغات لکھے تھے، انہی کو ان لوگوں نے اڑا لیا ہے، مولوی صاحب سے کون یہ پوچھ سکتا تھا کہ ہاتھ اور آنکھ کے نئے لغات یہ لوگ کہاں سے لاتے۔ اصل بات یہ تھی کہ مولوی صاحب امیر مینائی اور صاحب نور اللّغات کو اہل زبان سمجھتے ہی نہیں تھے، وہی دہلی و لکھنو کا پرانا جھگڑا۔

مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ مولوی صاحب کی گفتگو کا انداز کیا ہوتا تھا، مگر ان کی تحریر ہم سب کے سامنے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی والے ہونے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ ایچ پیچ کے قائل نہیں تھے اور سب کچھ لکھ دینے

کو غیر مناسب نہیں سمجھتے تھے، خاص کر لسانی بحثوں میں۔ ایسے میں اگر کہیں لکھنؤ کا ذکر آ گیا تو پھر مولوی صاحب سنجیدگی تحریر کی بھی کچھ ایسی پروا نہیں کرتے تھے اور نہ یہ دیکھتے تھے، کہ جہاں وہ باتیں لکھ رہے ہیں، وہ کوئی رسالہ نہیں لغت کی کتاب ہے۔ فرہنگ آصفیہ کو دیکھ جایئے، مقدمہ کتاب کی بات نہیں، الفاظ کی تشریح کے ذیل میں بھی وہ گنجائشیں نکال لیا کرتے تھے۔ میں مولوی صاحب کے مزاج، انداز فکر اور ایسے عالم میں طرز کلام کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ لفظ ''توتی'' کے ذیل میں مولوی صاحب نے لکھا ہے:

''اس لفظ کی تذکیر و تانیث پر جو لطیفہ حضرت استاد ذوق اور ایک لکھنوی شاعر سے ہوا، اسے ناظرین کی تفنن طبع کی غرض سے، درج کیا جاتا ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ استاد ذوق کے ایک لکھنوی ''دوست'' نے ناسخ کی ایک تازہ غزل سنائی، اسی زمین میں ان کو ذوق نے اپنی غزل سنائی جس میں یہ شعر بھی تھا:

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے ان دِنوں صیاد کا

اب باقی لطیفہ مختصراً مولوی صاحب کے لفظوں میں سنیے: شعر سنتے ہی چونکے اور فرمایا کہ ہیں! آپ نے طوطی کو مذکر باندھ دیا، حالاں کہ اس میں یائے معروف تانیث موجود ہے۔

استاد ذوق نے فرمایا کہ حضرت! محاورے پر کسی کے باپ کا اجارہ نہیں ہے۔ آج آپ میرے ساتھ چوک پر چلیے، جب شام کا وقت ہوا، دونوں صاحب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر، جہاں گزری لگتی ہے، پہنچے...... دیکھا...... ایک شہدے صاحب بھی طوطی کا پنجرہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ استاد ذوق نے اشارہ کیا: ذرا ان سے بھی دریافت کر لیجیے، آپ نے بے تکلف پوچھا: بھیا! تمہاری طوطی کیسی بولتی ہے؟ جواب دیا کہ میاں! بولتی تمہاری ہوگی، یاروں کا طوطی تو خوب بولتا ہے'' آپ نے مولوی صاحب کا انداز دیکھ لیا! اس فرضی لطیفے کا بھلا لغت سے کیا تعلق ہو سکتا تھا، مگر دہلی لکھنو کی بحث میں تعلق نکل آیا۔ سچ کہا گیا ہے کہ عاشقی میں سب کچھ جائز ہے۔

آج ہم لوگ فرہنگِ آصفیہ میں بہت سے عیب نکالتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اس میں بہت سے بحث طلب مقامات ہیں لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ آج بھی یہ لغت بعض اعتبارات سے بے مثال ہے۔ اس کی بڑائی اس وقت واضح ہوگی جب اسے کسی نئے لغت کے ساتھ رکھ کر دیکھیے مثلا ترقی اردو بورڈ کراچی کے ضخیم لغت کی چھ جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔ ان جلدوں کے مندرجات کا مقابلہ فرہنگ آصفیہ کے اندراجات سے کیا جائے تو جگہ جگہ اندھیرے اجالے کا فرق نظر آئے گا۔ الفاظ اور محاورات کے ذیل میں مولوی صاحب نے بہت سی ایسی تفصیلات لکھ دی ہیں جو آج اور کہیں مشکل سے ملیں گی۔ خاص کر رسم و رواج اور اصطلاحات کے سلسلے میں۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی آنکھوں سے بہت سی رسموں کو دیکھا تھا اور بہت سی چیزوں کو برتا تھا، جن سے آج کا لغت نگار واقف نہیں، وہ نرا نقل نویس ہے، ادھورا نقل نویس۔

مولوی صاحب فنافی اللّغت تھے۔ کیسی کیسی مصیبتیں اس سلسلے میں انہوں نے اٹھائیں۔ کتنے دروازوں پر مالی امداد کے لیے دستک دی۔ ایک بار ۱۹۱۲ء میں گھر میں آگ لگ گئی تو سارا

اثاثہ جل گیا، کتابیں بھی جل گئیں۔لیکن مولوی صاحب نے نہ ہمت ہاری نہ دل چھوٹا کیا۔کسی ادارے کی مدد سے انہوں نے اس کام کو شروع نہیں کیا تھا۔محض ذاتی دلچسپی نے ان کو لغت نویسی کی طرف مائل کیا۔اس ذاتی دلچسپی میں بہت بڑا حصہ اس احساس کا تھا کہ دہلی کی زبان محفوظ ہو جائے اور دہلی کی معاشرتی زندگی کے بہت سے مظاہر آ جائیں۔انہوں نے معمولی ملازمتیں کیں۔دلی میں بھی رہے۔دلی سے باہر بھی رہے،مگر لغت کے کام سے ایک دن کیا،ایک لحظہ بھی غافل نہیں رہے۔ایسے دل لگا کر محض اپنے شوق کی تسکین کی خاطر کام کرنے والے اب کہاں ہیں۔

مولوی صاحب دہلی کے آخری بڑے آدمی تھے جنہوں نے بڑے سے بڑے کاموں کو انفرادی طور انجام دینے کی مشرقی روایت کو برقرار رکھا اور اتنا بڑا لغت مرتب کر گئے۔صحیح ہے کہ ایسے کام اب ایک آدمی انجام نہیں دے سکتا،مگر ہمارے یہاں اب تک اجتماعی طور پر اور منصوبہ بندی کے تحت ادبی کام کرنے کی روایت پروان نہیں چڑھ سکی ہے اور لغت یا تاریخ ادب کے سلسلے میں جو پنچایتی کام اب تک ہوئے ہیں،ان کا احوال اس قدر تباہ ہے کہ ان کاموں کے کرنے والوں کو اگر روایتی لیبر کیمپ میں بھیج دیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔اس صورت حال کے تحت اب سے سوا سو برس پہلے جو اتنا بڑا کام ایک فرد واحد نے انجام دیا ہے اور جس میں خامیوں کے مقابلے میں خوبیوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں رہی ہے،اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔اگر کسی کو اس میں کچھ شک ہو تو اس لغت کے مقابلے کی اس زمانے کی کوئی ایک ہی مثال لے آویں۔اب تو مالی وسائل کی کمی نہیں۔سائنسی نقطہ نظر بھی عام ہو چکا ہے اور علم زبان نے بھی بہت ترقی کر لی ہے۔مولوی صاحب لسانیات سے واقف نہیں تھے (اور اس زمانے میں کوئی بھی واقف نہیں تھا) دولت مند بھی نہیں تھے،انہوں نے غلطیاں بھی بہت کی ہیں،وہ دہلی ولکھنو کے دبستانی جھگڑے میں بے طرح الجھے ہوئے تھے،اس کے باوجود دو وصف ایسے بھی تھے ان کے یہاں جن کا اب قحط ہے۔ایک تو یہ کہ انہوں نے پوری زندگی اپنی اس کے لیے وقف کر دی تھی اور پوری صلاحیت اور توفیق کے ساتھ بس اسی کے ہو کر رہ گئے تھے اور عمر عزیز کا دو تہائی حصہ اسی ایک کام کی نذر کر دیا۔آج ہے کوئی ایسا فدائی،ایسا مخلص اور ایسا ڈوب کر کام کرنے والا۔اس ایک وصف کے سامنے بہت سی خامیاں بے رنگ ہو کر رہ جایا کرتی ہیں۔دوسرے یہ کہ وہ صحیح معنی میں زبان سے واقف تھے۔اردو میں کتنا ہی بڑا لغت مرتب ہو جائے جو جدید معیار لغت نویسی کے لحاظ سے بھی اعلا درجے کا بھی ہو تب بھی فرہنگ آصفیہ کی اہمیت کم نہیں ہوگی۔کلاسیکی ادب پر کام کرنے والے خاص کر دہلی کی زبان پر کام کرنے والے ہمیشہ اس سے استفادہ پر ہمیشہ مجبور رہیں گے۔اس بنا پر کہ جو مختلف معاشرتی اور تہذیبی تفصیلات اس میں محفوظ ہیں،وہ کہیں اور نہیں ملیں گی اور زبان دہلی کے لحاظ سے روزمرہ محاورہ کے جو بہت سے نکات اس میں مندرج ہیں وہ نئے لغت میں ان کو نہیں ملیں گے۔ہم لوگ جو زبان اور لغت سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں اور ان موضوعات میں سر کھپاتے رہتے ہیں،ہمیشہ مولوی صاحب کو یاد رکھیں گے اور ان کے خلوص کو اور ڈوب کر کام کرنے کے انداز کو مثال میں پیش کرتے رہیں گے۔

(بشکریہ اخبار اردو، جنوری 2012ء)

☆☆☆

تعارف وتبصرہ

نام کتاب: مشعال المصابیح شرح مشکاۃ المصابیح
شارح: مولانا سید سلمان حسینی ندوی
ناشر : المعهد العالي للدراسات الشرعية
دار العلوم لندوة العلماء، لكناؤ – الهند
جلدیں : ۴ (مجموعی صفحات : ۱۲۶۷)
ورق اور سائز : متوسط
قیمت : درج نہیں
تبصرہ نگار: محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی

اہل علم اچھی طرح جانتے ہیں کہ قرآن مجید کے بعد علوم اسلامیہ کا بنیادی سرچشمہ ’’حدیث پاک‘‘ ہے، جس طرح قرآن مجید کی حفاظت کی ذمے داری اللہ تعالی نے لی ہے، اسی طرح حدیث پاک کی حفاظت وصیانت کی ذمے داری بھی اسی نے لی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ہر زمانے میں ایسے اشخاص کو پیدا کرتا رہاہے جنھوں نے اس کی حفاظت وخدمت کے حوالے سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں، اور اس عظیم ورثے کی خدمت کو اپنے لیے سعادت اور شرف سمجھا ہے۔

فن حدیث کو وسعت وترقی دینے اور اس کی حفاظت وخدمت کرنے کے سلسلے میں جلیل القدر علما اور محدثین عظام نے جو کاوشیں اور کاہشیں کی ہیں ان کا اندازہ ان لوگوں کو ہرگز نہیں ہوسکتا جو اس فن کے شناور نہیں۔ اس فن سے علما ومحدثین کے عشق اور قدر دانی کا عالم یہ رہا ہے کہ کسی نے متن حدیث کو جمع کرنے کی خدمت انجام دی تو کسی نے اس کی شرح وتحقیق کا فریضہ انجام دیا، کسی نے مشکل الفاظ کی شرح وتحقیق کی تو کسی نے احادیث کی تخریج اور اس کے متابعات وشواہد تلاش کرنے میں عمر عزیز کا ایک ایک حصہ نچوڑ دیا، کسی نے فقہی مباحث کو موضوع سخن بنایا تو کسی نے رواۃ ورجال کے بارے میں داد تحقیق دی، غرض یہ کہ اس فن کی مختلف شاخوں کی خدمت جس طرز وادا، جس باریک بینی ودقت نظری اور جس درجہ حزم واحتیاط سے کی گئی ہے دیگر مذاہب کی تاریخ سے اس کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔

حدیث کی خدمت کا ایک طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ بعض محدثین نے احادیث کے وسیع ذخیرے سے ’’منتخب حدیثوں کے مجموعے‘‘ تیار کیے، ایسے مجموعوں کی ایک قابل قدر اور قابل ذکر تعداد ہے، لیکن امام نوویؒ کی ’’ریاض الصالحین‘‘ اور امام ولی الدین خطیب تبریزیؒ کی ’’مشکاۃ المصابیح‘‘ کو علمی حلقوں میں جو مقبولیت وپذیرائی اور داد وتحسین حاصل ہوئی وہ دوسرے مجموعوں کا حصہ نہ بن سکی۔

آٹھویں صدی کے ممتاز اور جلیل القدر علما میں ولی الدین خطیب تبریزی کا نام نہایت ہی روشن ہے، آپ ایک وسیع النظر عالم، جلیل القدر محدث غیر معمولی فضل وکمال کی حامل شخصیت تھے، صلاح وتقوی اور زہد وعبادت کے ساتھ ساتھ فصاحت وبلاغت کے امام تسلیم کیے جاتے تھے، آپ کا سب سے عظیم الشان کارنامہ ’’مشکاۃ المصابیح‘‘ کی تالیف ہے، جو منتخب حدیثوں کا ایک حسین گلدستہ ہے، اور جو ہر دور کے اہل دل اور اصحاب فضل وکمال کی زندگی میں ایک ’’بہترین رفیق‘‘ کی حیثیت سے شامل رہی ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ لکھتے ہیں :

''یہ حدیث کی بڑی اہم اور مقبول کتابوں میں ہے، اور صحاح ستہ اور دوسری مستند کتب حدیث کا مجموعہ ہونے کی بنا پر خود بھی بہت معتبر سمجھی جاتی ہے، اس کی ترتیب اور تالیف میں امام بغوی کی مشہور کتاب ''مصابیح السنۃ'' پر اعتماد کیا گیا ہے ، اور یہ دراصل اس کا تکملہ اور ذیل ہے، گو''مشکاۃ المصابیح''، ''مصابیح السنۃ'' کا تکملہ ہے؛ تاہم اس میں کہیں کہیں حذف و اضافہ سے کام لیا گیا ہے، اس کی وجہ سے دونوں کی قدر میں فرق بھی ہو گیا ہے، یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ امام تبریزی نے امام بغوی ہی کی تحقیق پر اعتماد کر لینے کو کافی نہیں سمجھا ہے؛ بلکہ خود بھی مراجعت کر کے حدیثوں کے بارے میں چھان بین کی ہے''۔ (تذکرۃ المحدثین :۲/۴۵۴-۴۵۸)

مشکاۃ المصابیح کی اسی اہمیت اور مقبولیت کے پیش نظر محدثین اور بہت سے نامور علما نے اس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں، خطیب تبریزی کے استاذ علامہ طیبیؒ کی ''شرح الطیبی''، ملا علی قاریؒ کی ''مرقاۃ المفاتیح''، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی ''لمعات التنقیح'' اور ''أشعۃ اللمعات''، مولانا ادریس کاندھلویؒ کی ''التعلیق الصبیح''، علامہ قطب الدین دہلویؒ کی ''مظاہر حق'' اور مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری کی ''مرعاۃ المفاتیح''، مشکاۃ کی شروحات میں اپنا جداگانہ اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔

مشعال المصابیح :

مذکورہ بالا تمام شروحات کی اہمیت و افادیت کے باوجود ایک ایسی شرح کی ضرورت اب تک باقی تھی جو دور حاضر کے علمی اسلوب کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ حدیث کے طالب علم کو حدیث پاک کی اصل روح اور اس کے حقیقی منشا تک پہنچنے میں راست مدد کرتی ہو، الحمدللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ حدیث، عربی و اردو کے شعلہ بار خطیب اور بافیض عالم و داعی حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی دامت برکاتہم نے اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے ''مشعال المصابیح'' کے نام سے ایک ایسی ہی شرح تیار کی جس کی چار جلدیں اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں۔

پہلی جلد ''کتاب الایمان'' سے بحث کرتی ہے ، دوسری جلد ''کتاب العلم'' سے، تیسری جلد ''کتاب الطہارۃ'' پر مشتمل ہے جب کہ چوتھی جلد ''کتاب الصلاۃ'' کے ایک حصے کا احاطہ کرتی ہے۔

''مشعال المصابیح'' کے مقدمہ نگار علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی مدظلہ العالی نے اپنے مبسوط اور پر مغز مقدمے میں شرح اور شارح دونوں کا پوری وسعت قلبی کے ساتھ جو فاضلانہ اور منصفانہ تعارف و تجزیہ پیش کیا ہے، اس کے کچھ حصے پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا ، علامہ قرضاوی اس شرح کی ضرورت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''کتب حدیث کی رائج شروحات میں اصطلاحی الفاظ کی بھرمار کی بنا پر ایک عرصے سے یہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ صحاح ستہ اور حدیث کے دوسرے تمام مجموعوں کی نہ سہی؛ لیکن ان میں سے بعض کی ایسی شرح تیار کی جائے جس میں دور حاضر کے علمی اور ادبی اسلوب کی بھرپور رعایت رکھی گئی ہو، میری خود دلی تمنا تھی کہ میں اس کام کو انجام دوں؛ بعض مشایخ کی توجہ اور خواہش میرے اس آرزو کے لیے مہمیز کا کام بھی کرتی تھی ؛ لیکن یہ سعادت میرے لیے مقدر نہ تھی، اللہ کا شکر ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کی تمنائیں اور میری آرزو کی تکمیل برادر عزیز، کامیاب معلم و مدرس ، بافیض عالم و داعی اور شیریں زباں خطیب و ادیب شیخ سلمان حسینی ندوی کی اس کتاب کے ذریعہ ہو گئی''۔

اس شرح کے طرز و اسلوب، زبان و بیان اور مجموعی امتیازات

وخصوصیات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شیخ نے حدیث پاک کو اچھی طرح ہضم کر کے انتہائی آسان، سہل اور شستہ وشگفتہ زبان میں اس کی شرح وترجمانی کی ہے، جو متخصص وغیر متخصص دونوں طبقوں کے لیے یکساں مفید ہے، شرح وترجمانی کا اسلوب اس قدر واضح ہے کہ اس پر ''تشریح شدہ کلام'' کا گمان ہوتا ہے، یا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''کلام نبوت کا ایک ٹکڑا ہے'' جس کا عکس شارح نے بڑی مہارت کے ساتھ اپنے کلام میں کھینچ لیا ہے ......آپ اس کتاب کے جس حصے کو پڑھیں ایسا معلوم ہوگا کہ آپ کے سامنے ''جوئے شیریں'' رواں ہے، نہ اصطلاحات کی پیچیدگی ہے، نہ زبان کی ژولیدگی، نہ تقسیمات کی بندشیں ہیں اور نہ غیر مربوط جملوں کی خشکیاں ،البتہ '' تسہیلات وتبشیرات''(جنہیں فضلائے ندوہ بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ اپنی ادبی تحریروں اور علمی تحقیقات کا حصہ بناتے ہیں) کی ایک نہر سلسبیل ضرور ہے جس سے قلب ونظر اور ذوق ووجدان دونوں سرور پاتے ہیں ـــــ حدیث کی شرح وترجمانی کے دوران شیخ سلمان ایسے لگتے ہیں گویا سمندر سے لے لے کر پی رہے ہوں ،باغ سے توڑ توڑ اور چن چن کر دے رہے ہوں ،اپنے خزانے کو فیاضی کے ساتھ لٹا رہے ہوں ـــ ایسا معلوم ہوتا ہے اللہ تعالی نے اس شرح کو ان کے لیے سہل اور ان کی نگاہ میں اسے محبوب اور لذیذ بنا دیا ہے ، حیرت انگیز سلاست وروانی اس پر شاہد ہیں ـــ اس شرح کے مطالعے کے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ گویا حلقۂ درس میں تشریف فرما ہیں ،طلبہ ان کے سامنے ہیں ،اور وہ عالمانہ وقار ،معلمانہ ذکاوت وفراست ،محققانہ صلاحیت اور ادیبانہ لطافت وحلاوت سے سامعین کو مسحور کر رہے ہیں ، نہ کسی پر نکتہ چینی ، نہ اپنے دل میں کسی کے لیے دشمنی ،حنفی ہونے کے باوجود اہل حدیث علما کی تحقیقات وتصنیفات سے فائدہ اٹھاتے نظر آتے ہیں، انہیں اپنا اور اپنی جماعت کا حریف نہیں سمجھتے ، وہ دوسروں سے ''خیر کی چیزیں'' لے لیتے ہیں اور ''شر کی چیزیں'' چھوڑ دیتے ہیں''۔

جماعت اہل حدیث کے ممتاز عالم دین مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری کی وقیع تصنیف '' مرعاۃ المفاتیح '' کی قدر وقیمت کے اعتراف کے ساتھ لکھتے ہیں :

'' باوجود یہ کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر حاوی ہے، مضامین ومعانی کے لحاظ سے غیر تشنہ ہے ؛لیکن شرح وتحقیق اور طرز واسلوب کے لحاظ سے ''عصری منہج '' کی رعایت اپنے اندر نہیں رکھتی ،اس کے برعکس شیخ سلمان نے شروع ہی سے ''طرز قدیم اور قدما کے اسلوب'' کی بجائے ''طرز جدید اور معاصر اسلوب'' کا التزام کیا ہے، اور یہ دور حاضر کے مذاق علمی کے لحاظ سے بہت ضروری تھا، کیوں کہ قدما کا طرز کوئی منزل من اللہ شے یا کسی نبی مرسل کی وصیت کا حصہ نہیں جس سے سر مو انحراف روا نہ ہو، یہ شیخ سلمان کے ساتھ اللہ کا خاص فضل ہے کہ اس نے ان کے لیے سب سے زیادہ معتدل راہ کھولی''۔

مشعال المصابیح کی چند نمایاں خصوصیات :

۱۔ ہر باب کو قرآنی آیات سے مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ کتاب کے ہر باب کے آغاز میں باب کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، جس سے باب کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

۳۔ باب کے تعارف کے ضمن میں باب سے متعلق موضوعات کی طرف مختصر سا اشارہ کر دیا گیا ہے، جس سے بیک

نظر معلوم ہوجاتا ہے کہ باب کی تینوں فصلوں میں کون سا موضوع زیر بحث ہے۔

۴۔ شارح کے پیش نظر صرف ''مشکاۃ المصابیح'' کی احادیث کی تشریح نہیں ہے ، بلکہ اس کے اندر موجود جتنے ابواب ہیں ان پر کتاب وسنت کی روشنی میں سیر حاصل گفتگو مقصود ہے،اس لیے انہوں نے ہر باب کومستقل ایک کتاب کی شکل دے دی ہے ،اور موضوع کے لحاظ سے جلدوں کی تقسیم فرمائی ہے،مثلا پہلی جلد کتاب الایمان سے متعلق ہے،دوسری کتاب العلم سے،تیسری کتاب الطہارۃ سے اور چوتھی کتاب الصلاۃ سے الخ........،اس طرح اس کتاب کے مطالعہ کرنے والے کی نگاہ سے نہ صرف مشکاۃ کی ساری حدیثیں گزرجائیں گی ؛ بلکہ ایک موضوع سے متعلق دیگر کتب حدیث میں جوارشادات نبوی موجود ہیں بڑی حدتک ان پربھی ایک سرسری نظر پڑجائے گی۔

۵۔ جدیدعصری اسلوب کی رعایت کرتے ہوئے شرح کی زبان حددرجہ سہل،واضح ،نہایت شگفتہ،شیریں اورمسحورکن رکھی گئی ہے،زبان کی لطافت وشگفتگی اوراسلوب کی سلاست وروانی نے پوری کتاب کو بالعموم اور بعض صفحات کو بالخصوص قطعۂ چمن میں تبدیل کردیا ہے۔

۶۔ دقیق اورغیرمتعلق طول طولانی بحثوں سے احتراز کیا گیا ہے، پوری کوشش اس بات پرصرف کی گئی ہے کہ قاری پیچیدہ مباحث میں الجھے بغیر حدیث کی روح اور اس کے اصل منشا سےاچھی طرح واقف ہوجائے۔

۷۔ تشریح وتفہیم میں اختصارکوپیش نظر رکھا گیا ہے؛لیکن اختصار بھی اعتدال کی حدتک ہے،ضرورت کے پیش نظر بعض مقامات پر پورے شرح وبسط کے ساتھ تشفی بخش گفتگو کی گئی ہے، بالفاظ دیگر ''اطناب ممل اورایجازمخل'' کے عیب سے یہ شرح مکمل طورپر پاک ہے۔

۸۔ حدیث کی تشریح میں منہج ولی اللہی کوپیش نظررکھا گیا ہے، (یعنی محدثین وفقہاءاوراہل حدیث واہل رائے اورائمۂ اربعہ کے درمیان تطبیق وتوفیق کا منہج)جوندوۃ العلما کااختیارکردہ اور پسندیدہ منہج ہے،شارح نے اس منہج کی پاسداری کا بھرپورخیال رکھا ہے، دوسرے مسلک کی تنقیص وتردید کی بجائے حتی الامکان دوری کونزدیکی میں تبدیل کرنے کی محمودکوشش فرمائی ہے۔

۹۔ یہ شرح کسی خاص مسلک کی ترجمانی نہیں کرتی،حنفی المسلک ہونے کے باوجودشارح نے فقہ حنفی کے مباحث سے حتی الامکان شرح کوہلکا رکھنے کی کوشش کی ہے،سارے ائمہ اوران کے آراءوافکارکے احترام کوملحوظ رکھا گیا ہے،دلائل کے نقل کرنے میں دیگرفقہاء ومجتہدین کے اقوال بھی پیش کیے گئے ہیں۔

۱۰۔ حدیث کی تشریح وتفہیم میں اس سے متعلق آیات قرآنیہ اوراحادیث نبویہ سے استشہاد کیا گیا ہے،محدثین اور شارحین حدیث کے اقوال سے بھی اپنی بات کومدلل کیا گیا ہے،لیکن جہاں پراختلاف کی گنجائش تھی وہاں پورے احترام کےساتھ شارح نے اپنانقطۂ نظرواضح کیاہے،مثلا **''کتاب الصلاۃ''** میں ایک باب آیاہے'' **باب مالایجوزمن العمل في الصلاۃ ومایباح منه**'' ،اس باب کی پہلی فصل میں خطیب تبریزیؒ نے جوحدیث پیش کی ہے اس میں علم رمل سے متعلق گفتگوبھی ہے(**ومنا رجال یخطون**)علامہ ابن حجرؒ نے اس علم کے حوالے سے علما کا موقف حرمت کا بتلایا ہے،اورخود علامہ کا بھی یہی خیال ظاہر ہوتا ہے ،شارح نے یہاں پرسخت موقف اختیار کیا ہے ،اورلکھا ہے کہ جب اللہ کے رسولﷺ

نے اس علم کو حرام نہیں کیا تو ہمیں حرام کہنے یا کرنے کی کیا ضرورت ہے، جب تک ہم اس علم کی حقیقت تک نہ پہنچ جائیں ہمیں حرام ہونے کا فتوی صادر نہیں کرنا چاہیے، کتنے ایسے علوم ہیں جو پہلے پردۂ غیب میں تھے اب ان سے پردہ اٹھ چکا ہے (مثلا: ڈی.این.اے ٹیسٹ)، اور کتنے ایسے ہیں جن سے پردہ اٹھنا اب بھی باقی ہیں، اس لیے تحقیق وریسرچ کے دروازے جب تک کھلے ہیں حرمت کا فتوی دینے میں احتیاط لازم ہے۔

۱۱۔ فقہی اور فکری اختلافات کو نقل کرنے اور فقہاء ومجتہدین کے مذاہب ودلائل بیان کرنے میں قوی مسلک کو ترجیح دی گئی ہے، گاہے گاہے شارح نے اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کیا ہے، خاص طور پر جن مقامات پر شارح نے مسلم معاشرے کی اصلاح کے حوالے سے گفتگو کی ہے وہ نہایت ہی قابل قدر اور چشم کشا ہے، **کتاب الطہارۃ** کے ''**باب السواک**'' کے ذیل میں نظافت کے سلسلے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان پر توجہ دینا حد درجہ ضروری ہے، شارح نے پان اور تمبا کو استعمال کرنے والوں پر بڑی شدت کے ساتھ ''نشتر'' لگائی ہے، اسی طرح آج کل کے رسمی جلسوں پر ''**کتاب العلم**'' کے اندر حدیث نمبر(۱۰) کے ذیل میں سخت تنقید فرمائی ہے اور لکھا ہے:

''ولاينبغي أن تكون – الخطب والمواعظ والندوات والاحتفالات – تقليدية عادية،فليس ذلك من سنة الرسول صلى الله عليه وسلم وأصحابه،بل لابد أن تكون للعمل والحركة والنشاط والتطبيق''.

۱۲۔ حدیث کے مابین تعارض پیدا ہونے کی صورت میں رفع تعارض کا فریضہ بھی انجام دیا گیا ہے، یا دیگر روایتوں کو سامنے رکھ کر تطبیق یا ترجیح کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ (رفع تعارض کی مثال کے لیے دیکھیے: کتاب الطہارۃ، باب سنن الوضوء، ص:۱۲۵، دو حدیثوں میں تطبیق کی مثال کے لیے: کتاب الایمان، ص:۶۲، اور ترجیح کی مثال کے لیے: کتاب الطہارۃ، باب مایوجب الوضوء، ص:۴۷-۵۲)۔

۱۳۔ حدیث کی تخریج وترقیم بھی کردی گئی ہے، مسلسل حدیثوں کی ترقیم کے ساتھ ساتھ ابواب کی حدیثوں کی بھی الگ سے ترقیم کی گئی ہے۔

۱۴۔ اصطلاحات شرعیہ کی لغوی اور اصطلاحی تشریح وتحقیق بھی پیش کی گئی ہے۔

۱۵۔ حدیث کے مشکل اور غریب الفاظ کی توضیح بھی کردی گئی ہے۔

۱۶۔ حدیث اعراب سے مزین ہے۔

۱۷۔ ضرورت کے موقعوں پر حدیث کی سندی حیثیت کو واضح اور اس کا درجہ ورتبہ متعین کیا گیا ہے، ساتھ ہی اس کی صحت وضعف کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا ہے۔

۱۸۔ اس شرح کا خاص الخاص امتیاز **فقہ الحدیث اور حدیث کے تطبیقی پہلو** کو اجاگر کرنا ہے، حدیث سے حاصل ہونے والے فوائد ونتائج کو نکات وار بیان کرکے حدیث کی روح تک پہنچنے کا راستہ آسان کردیا گیا ہے، جس سے ان لوگوں کے لیے خاص طور پر سہولت ہوگئی ہے جو کسی حدیث کی مراد تک پہنچنے کے لیے اپنے پاس وقت نہیں پاتے۔

۱۹۔ ہر کتاب کے شروع میں شارح نے موضوع کتاب سے متعلق ایک فاضلانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے، جس میں موضوع کی اہمیت وضرورت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے، خاص طور سے دوسری جلد کے مقدمے میں علم کی اہمیت وافادیت، علوم دینیہ

اوردنیویہ کی تفریق اوراس کے اسباب ونتائج اوراس کے مفاسد ونقصانات کے حوالے سے جومدلل گفتگو کی گئی ہے وہ بڑی قیمتی اورنہایت ہی چشم کشا ہے، ہر چند کہ شارح کے بعض خیالات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا؛لیکن جو گوشے انہوں نے اٹھائے ہیں ان سے پہلوتہی کرنا بھی ناانصافی ہوگی۔

۲۰۔ کتاب پروف کی غلطیوں سےتقریباًپاک ہے،البتہ کئی مقامات پر’’ عـلى‘‘ کی جگہ ’’ عـلي‘‘ ہوگیاہے۔ورق متوسط ہے ،سرورق دلکش اوردیدہ زیب ہے ،بعض جلدیں متوسط اوربعض ضخیم ہیں۔

خلاصہ یہ کہ یہ ایک جامع اورنافع شرح ہے ،جوعمدہ تحقیقات،لطیف نکات اورشاندار مباحث سے مزین ہے،جس میں جدت وندرت بھی ہے اور لطافت ودلکشی بھی،مضبوط دلائل بھی ہیں اورروشن استدلالات بھی،الفاظ وتعبیرات میں بلا کی چاشنی بھی ہےاورطرزواسلوب میں حددرجہ دلکشی بھی،غیرضروری اختلافات ونزاعات سےنفرت کااظہار بھی ہے اورلازمی اتحادومحبت کی پربہاردعوت بھی ، اور معاشرے کی ناہمواریوں اورخرابیوں پرجرأت مندانہ تعمیری نقدبھی.........بعض مباحث وآراء سے ارباب علم ودانش اور صاحبان فکرونظر کواختلاف ہوسکتا ہے،اورہونا بھی چاہیے کہ علمی اختلافات اگر صحیح جذبے اوردرست نیت کے ساتھ کیے جائیں تواس سے علم میں نکھار اورذہن وفکر میں جلا پیدا ہوتی ہے،قوت فہم وادراک کوطاقت ملتی ہے،اور بسااوقات صواب وخطا کے فیصلے میں اس سے مدد ملتی ہے؛لیکن ان اختلافات کی وجہ سے کتاب کی قدرومنزلت میں کوئی فرق ہرگزنہیں پڑتا۔

امید ہے کہ ارشادت نبوی کا یہ حسین گلدستہ اہل ذوق کے لیے نظرافروزاوراہل دل کے لیے سرمۂ بصیرت ثابت ہوگا،اور اس کے پھولوں کی خوشبوطالبین حدیث کے مشام جاں کومعطر کرے گی ،اورعلمی حلقوں میں اس گراں قدعلمی تحفے کی قدر کی جائے گی۔

☆

نام کتاب: قیام امن اوراسلام

مصنف: مولانا کمال اختر قاسمی

صفحات: ۱۸۴

قیمت: ۱۰۰روپیہ

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

زیر مطالعہ کتاب ایک نہایت عمدہ علمی کاوش ہے، دنیا بھر میں امن کی کوشش ہوتی رہتی ہیں، امن کے لیے کانفرنسز کا انعقاد گویا ایک فیشن بن گیا ہے،لیکن یہ سوال ہنوز باقی ہے کہ جوں جوں دوا کی جارہی ہے مرض کیوں بڑھتا جارہا ہے؟ آخر سماج سے امن باوجودمتعددکوششوں کے کیوں ناپید ہوتا جارہا ہے؟ مصنف کتاب کے سامنے بھی یہی سوال ہے وہ اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: ’’غوروفکر کرنے کی ضرورت ہے کہ اس عالمی بحران کے اہم اسباب وعوامل کیا ہیں،جن کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہورہی ہے،قیام امن کی عالمی کوششوں اورعلمی وفکری، تمدنی اورثقافتی ارتقا کے دعووں کے باوجود دنیا سے امن کیوں مفقود ہوتا جارہا ہے‘‘۔ اس جملہ سے ہی مصنف کے پختہ اسلامی ذہن اورصحیح الفکری پر اعتماد پختہ تر ہوجاتا ہے،ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ اس پیش لفظ کو ذرا طول دیتے اور جس علمی وفکری،تمدنی ارتقا کوانہوں نے’’دعووں‘‘ سےتعبیر کیا ہے اور بجاتعبیر کیا ہے،انہیں آئینہ دکھاتے ،ساتھ ہی اسلامی تمدن اوراسلامی فکر کےاحسانات اور قیام امن کی کوششوں کامختصر سا

موازنہ کر دیتے تو اس کی بنیاد پر آئندہ صفحات قاری کو مضبوط فکری غذا فراہم کرتے۔

کتاب کا اسلوب منطقی اور معروضی ہے، انداز تحریر نہایت شستہ اور علمی ہے، گرچہ یہ منصف کی غالبا پہلی باقاعدہ تصنیفی کاوش ہے مگر اس میں ایک پختہ کار صاحب قلم کی جھلک نظر آتی ہے، البتہ بعض لفظوں کا استعمال یا بعض ترکیبیں غیر فصیح یا ناموزوں محسوس ہوئیں جو بہرحال اتنی اہم بات نہیں ہے، کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب ''عصر حاضر میں بدامنی کی چند شکلیں'' ہے۔ اس میں چار فصلیں قائم کی گئی ہیں، جنگی صورت حال اور اس کے اسباب، دہشت گردی، جرائم، گروہی فسادات جیسے موضوعات کو بالترتیب ہر فصل کا عنوان بنایا گیا ہے، مصنف نے نہایت اختصار کے ساتھ حقائق کو ان مباحث میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے، فصل اول جو دہشت گردی سے متعلق ہے اس میں راقم کو اس کمی کا احساس ہوا کہ دہشت گردی کی تعریف کے تعین کی کوشش نہیں کی گئی، اگر ایسا کیا جاتا تو مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا اور بقیہ مباحث اس فصل کے بالکل آسان ہو جاتے، اسی طرح چوتھی فصل میں ''قومی تعصب'' کے ضمن میں عرب قومیت کی تحریک کو بھی موضوع بنانا چاہیے تھا جس کا خاکہ مغرب نے تیار کیا اور جس کے نتیجہ میں عربوں کی طاقت اور ملت اسلامیہ کی حالت ابتر ہوتی چلی گئی، ''مذہبی تعصب'' کے عنوان سے جو بحث کی گئی وہ قدرے تفصیل طلب تھی لیکن مصنف نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے جس کے سبب مصنف کی مراد پوری طرح واضح نہیں ہے۔

دوسرا باب ''بدامنی کے بعض اہم عوامل اور ان کا اسلامی حل'' ہے، اس میں دو فصلیں ہیں جرائم کا انسداد اور اسلامی تعلیمات نیز بدامنی کے دیگر اہم عوامل، مصنف نے اس باب میں نہایت عمدہ بحث کی ہے، یقیناً انہوں نے جن عوامل کی طرف اشارہ کیا ہے وہ اس میں صائب قرار دے جائیں گے؛ لیکن راقم کا خیال ہے کہ بدامنی کے قیام میں سب سے بنیادی عنصر نظام تعلیم اور نصاب تعلیم ہے، لازمی طور پر اس کو موضوع بحث بنانا چاہیے، روح، معاد اور تصور خدا سے عاری نصاب ونظام کیا ایک مسلمان کو حرص وطمع اور حب دنیا، غصب، قتل وخوں ریزی اور جن دیگر اسباب وعوامل فساد کا ذکر کیا ہے سے روک سکتا ہے؟ آخر یہ مفاسد جنم کہاں سے لیتے ہیں؟ ان جرائم کو انجام دینے والے مجرم کون لوگ ہیں؟ آج دنیا کے سب سے بڑے قاتل، دہشت گرد، لٹیرے، ڈرگس کو فروغ دینے والے، لوٹ مار کی اسکیمیں بنانے والے دنیا کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے، مہذب اور ذہین ترین لوگ ہیں، یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جو ہماری بحث وتحقیق کا موضوع بننے سے رہ جاتا ہے جبکہ سارا فساد اسی کے سبب ظاہر ہوتا ہے، اور تمام مفاسد وکرپشن اور قتل وغارت گری کی مہم کے تانے بانے دنیا کے ذہین ترین اور بہت پڑھے لکھے لوگ ہی تیار کرتے ہیں۔

تیسرا باب ''اسلام کا نظام امن'' ہے، اس میں پانچ فصلیں قائم کی گئی ہیں، جن کے عنوان اس طرح ہیں: انفرادی امن، معاشرتی اور خاندانی امن، اجتماعی امن، عالمی امن، اسلام کا تصور جنگ، بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کتاب کا یہ باب مصنف کی تمام تر عرق ریزی کا نچوڑ ہے، اس کی ہر فصل نہایت قیمتی اور اسلامی تمدن ونظام پر اعتماد بحال کرنے میں مدومعاون ہے، اس باب میں نہایت متوازن انداز میں اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اسلام کی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے، کیا ہی خوب ہوتا کہ خلاصہ بحث بھی پیش کیا جاتا اور اس میں یہ بات درج

کی جاتی کہ اسلامی دور ہی تھا جس میں دنیا نے امن کا نظارہ کیا تھا اور سکون محسوس کیا تھا، پھر جب اسلامی تعلیمات کو مرجع حیات سمجھ لیا جائے گا تو سکون وچین میسر ہوگا، روح وخدا کے تصور سے عاری تہذیب حیوانی تہذیب تو ہو سکتی ہے، انسانی تہذیب نہیں، انسانوں کی دنیا میں کسی بھی حیوانی تہذیب کی عمر سو سال سے زیادہ نہیں رہی، موجودہ تہذیب کا سورج غروب ہونے کو ہے، ضرورت ہے کہ اہل ایمان تیار ہو جائیں اور بڑھ کر ہاتھ میں مینا اٹھا لیں، اور اس طرح مشرق ومغرب میں ایک نئے دور کا آغاز ہو سکے۔

میں جواں سال مصنف کو صمیم قلب سے اس ایمانی اور علمی کاوش پر مبارکباد پیش کرتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ پڑھے لکھے لوگ اس کتاب کا پرزور استقبال کریں گے، یہ کتاب تجدد کے ماروں کے لیے بھی ایک آئینہ ہے، اگر عوامل فساد میں نظام ونصاب تعلیم کی بحث بھی ہوتی تو متجددین کے لیے آئینہ شفاف ہوتا، ضرورت ہے کہ ایسی کتابوں کو ہندی وانگریزی میں بھی منتقل کیا جائے جو عہد جدید کے موضوعات میں مدلل ومسکت جواب بن سکتی ہیں۔

☆

نام کتاب: شعرائے بھٹکل کی نعتیہ شاعری (طبع دوم)
مصنف: ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی
صفحات: ۱۹۲
قیمت: ۲۰۰
ناشر: اپلائڈ بکس، نئی دہلی۔
تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
ملنے کے پتے: اردو بک ریویو، نئی دہلی، کتب خانہ انجمن ترقی اردو نئی دہلی، اسلامک بک سینٹر بنگلور۔

یہ کتاب مسلمانوں کے ایک شاداب خطے کے نعت گو شعراء کا تذکرہ ہے، بھٹکل ہندستان کا ایک ایسا شاداب و مردم خیز علاقہ ہے جہاں کے مسلمانوں کی دینی، اخلاقی اور علمی حالت دیکھ کر اخوت اسلامی سے آشنا ہر شخص بہت سکون محسوس کرتا ہے، برا ہو اس تعصب کا جو قوموں اور علاقوں کی خصوصیات کو یا تو پردۂ خفا میں رکھتا ہے یا پھر تعلی کا آسان شکار بنا کر بے آشنا بنا دیتا ہے، خطۂ بھٹکل کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہاں اسلامی اقدار وروایات کی حفاظت و پاسداری کا مزاج پایا جاتا ہے، تعلیمی تحریک مدت دراز سے شباب پر ہے، بھٹکل کے پرلطف و پرفضا علاقے اور پرسکون و مذہبی ماحول میں نعتیہ شاعری ناپید ہوتی، یہ ممکن نہ تھا، حیرت کی بات یہ ہے کہ صوبۂ کرناٹک کے اس خطہ کی جس نعتیہ شاعری کو موضوع بنایا گیا ہے اس کی زبان ''اردو'' ہے، اس کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ اردو کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے، ویسے بھی اردو تقریبا تمام ہندستانیوں کی زبان رہی ہے، پھر نعتیہ شاعری گرچہ دنیا کی ہر زبان میں پائی جاتی ہے مگر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عربی وفارسی کے بعد نعتیہ شاعری کا سب سے بڑا سرمایہ اردو میں ہی پایا جاتا ہے، نعت کے خاص اور مشہور شعراء کے علاوہ شاید ہی کوئی قابل ذکر شاعر ہو جس نے نعت کہنے کی سعادت حاصل نہ کی ہو۔

شاہ رشاد عثمانی قابل صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے فن نعت گوئی کو مختلف پہلوؤں سے اپنی علمی کاوشوں کا موضوع بنا رکھا ہے، اس پر بھی وہ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بھٹکل میں موجود اس عظیم نعتیہ سرمایہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا،

پیش نظر مجموعہ میں مصنف نے ۲۸ شعراء کا تذکرہ اور ان کا نمونۂ کلام پیش کیا ہے، ان شعراء میں بعض بزرگ، کچھ خورد اور کچھ جواں سال طبع آزمائی کرنے والے شامل ہیں، کتاب کی

ابتدا میں مصنف نے ''نعت کا فن'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جبکہ دوسرا مضمون ''نعت کی دینی حیثیت و اہمیت'' ہے، ان دونوں مضامین کے مطالعہ سے ان کا ذوق، تنقیدی بصیرت اور نعت کے تئیں ان کے شفاف رجحان کا پتہ چلتا ہے، ان مضامین کو پڑھنے لینے کے بعد آئندہ صفحات میں درج کی گئی نعتوں کو بے چوں چرا پڑھا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ دونوں مضمون مصنف کی صحیح الفکری کو صاد کرنے کے ساتھ یہ واضح کردیتے ہیں کہ نعت وحمد میں کیا فرق ہے اور نعت کہنے میں الوہیت ورسالت کے فرق کو ملحوظ رکھنا کس قدر ضروری ہے، اسی طرح تیسرا مضمون ''بھٹکل کا ادبی وشعری ماحول'' نہایت اہم ہے، جس سے بھٹکل میں اردو کی تاریخ اور بالخصوص نعتیہ شاعری کی تاریخ سے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں، کتاب کے آخر میں تین مضامین بطور ضمیمہ شامل کیے گئے ہیں، جن کو کتاب کے موضوع سے کوئی مناسبت نہیں، کتاب کے موضوع اور موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ان مضامین کو علحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کیا جانا زیادہ بہتر تھا۔

مصنف نے شعراء کا مختصر تذکرہ کیا ہے، ہر شاعر کی نعتیہ شاعری پر سطر دو سطر میں مختصر مگر جامع کلام کیا ہے، پھر اس کی نعتیہ شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں، ان نعتوں کے مطالعہ سے اہالیان بھٹکل کی صحیح العقیدگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے، فنی اور لسانی لحاظ سے تو ان نعتوں پر کہیں کہیں کلام ممکن ہے مگر فکری لحاظ سے ہمارے طائرانہ مطالعہ کے مطابق کلام کی قطعی گنجائش نہیں۔

مصنف قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ایک دستاویزی کتاب مرتب کردی ہے، مستقبل میں یہ کتاب اردو اور اردو کی نعتیہ شاعری کی تاریخ میں اہم مرجع ثابت ہوگی، اس کا مطالعہ یوں بھی فائدہ سے خالی نہیں؛ مگر خاص بات یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بھٹکل کے پاکیزہ رجحان اور پاکیزہ ماحول کی جو تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے وہ اس کتاب کی منفرد خصوصیت ہے۔

☆

نام کتاب: علی گڑھ کی اردو صحافت عہد بہ عہد (طبع دوم)

مصنف: اسعد فیصل فاروقی

صفحات: ۵۰۴

ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس

تبصرہ نگار: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

ملنے کے پتے: ایجوکیشنل بک ہاؤس، اسعد فیصل فاروقی شعبۂ ترسیل عامہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

اسعد فیصل فاروقی کا نام صحافت اور بالخصوص علمی صحافت میں اب غیر معروف نہیں رہا، وہ جدید تعلیم یافتہ ہیں، لیکن ان کا علمی ذوق قدیم اہل علم کی طرح ہے، ان کی یہ کتاب اس دعوی کی منہ بولتی دلیل ہے، انہوں نے علی گڑھ کے طبیہ کالج سے بی یو ایم ایس اور ایم ڈی کیا ہے، لیکن قلم وقرطاس سے ان کا رشتہ بہت مضبوط ہے، بلکہ ان کی دلچسپی کا یہی اصل میدان ہے، اب وہ شعبۂ ترسیل عامہ (ماس کمیونیکیشن) میں ڈاکٹریٹ کررہے ہیں، خاص بات یہ ہے کہ وہ صحیح الفکر اور صالح نوجوان ہیں، اس کتاب سے قبل وہ طبی صحافت کی تاریخ رقم کرچکے ہیں، اب ان کی اس موجودہ کتاب نے اگر ایک جانب علی گڑھ کی یافت میں ایک سنگ میل کا کام کیا ہے تو دوسری طرف ان کے علمی مقام کا بھی تعین کردیا ہے۔

مذکورہ کتاب علی گڑھ کی اردو صحافت کی ایک دستاویزی تاریخ ہے، مصنف نے اس کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے، باب اول میں علی گڑھ میں اردو صحافت کی ابتدا کا تاریخی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، باب دوم میں بیسویں صدی

کے نصف اول میں علی گڑھ کی اردو صحافت کا جائزہ لیا گیا ہے، باب سوم میں آزادی کے بعد علی گڑھ میں اردو صحافت کی رفتار اور اس کے آثار موضوع بحث بنائے گئے ہیں، باب چہارم میں علی گڑھ سے شائع ہونے والے موجودہ اخبارات و رسائل پر تبصرہ کیا گیا ہے، باب پنجم میں علی گڑھ کی اردو صحافت کے انتہائی اہم اور ناگزیر حصہ کو موضوع بنایا گیا ہے، چونکہ مسلم یونیورسٹی کے مختلف شعبوں اور اقامتی ہالوں سے شائع ہونے والے طلبہ کے مجلّات یہاں کی اردو صحافت کا اہم حصہ ہیں، اس لئے مصنف نے اس کا پورا خیال رکھا اور باب پنجم میں اس کے ذکر سے یہاں کی تاریخ صحافت کو مکمل کر دیا ہے، ابتدا میں عابد رضا بیدار صاحب کا مقدمہ اور پروفیسر شافع قدوائی کا تعارف ہے، آخر میں ضمیمہ، کتابیات اور تصاویر ہیں، جن کے سبب کتاب کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے، اس کتاب کی اشاعت سے ایک بڑا کام انجام پایا ہے، کیوں کہ اردو کی تاریخ میں دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد اگر خاص اہمیت کے حامل ہیں تو متعدد حوالوں کے ساتھ بالخصوص صحافت کے حوالہ سے علی گڑھ کی اہمیت بھی کسی سے کم نہیں، اگر ۱۸۲۲ میں اردو صحافت کی ابتدا کا سراغ ملتا ہے تو ۱۸۵۳ میں ہی علی گڑھ نے بھی دنیائے صحافت میں قدم رکھ دیا ہے، اور پھر سرسید احمد خاں کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نے اردو زبان کو ایک الگ رخ دیا ہے، اردو صحافت کو ایک نئی پہچان دی ہے، فکری اختلاف سے قطع نظر تعلیمی تحریک کو ایک جہت اور ایک رفتار عطا کی ہے، مذکورہ وجوہ کے سبب یہ دستاویزی تاریخ گرچہ دیر سے منظر عام پر آئی مگر درست آئی ہے، مصنف قابل صد مبارکباد ہیں کہ انہوں نے ایک طویل مدت (۱۸۵۳-۲۰۱۵) پر مشتمل علی گڑھ کی اردو صحافت کی تاریخ کو تحقیقی و تجزیاتی اور علمی اسلوب میں مستند جائزہ کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔

کتاب کی گوناگوں خصوصیات کے باوصف راقم کو یہ نقص بہرحال نظر آتا ہے کہ محقق نے اخبارات و رسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے تحقیق کے تمام تقاضے حتی الوسع پورے کیے ہیں مگر ان کے تبصرے سے متعدد رسائل کے علمی و فکری معیار و رجحان کا تعین ایک مشکل امر ہے، اگرچہ انہوں نے مختصر اور جامع تبصرہ کرنے کی کوشش کی ہے، بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ انہوں نے ایک اچھا جائزہ تو پیش کیا ہے مگر ناقدانہ محاسبہ کا کام کچھ تشنہ رہ گیا ہے۔

بہرحال جواں سال و جواں عزم محقق نے اس کتاب میں علی گڑھ کی ایک اور شناخت کو بڑے مدلل انداز میں ثابت کر دیا ہے، دنیا کے لیے یہ کتاب دلیل ہے کہ علی گڑھ گہوارۂ علم و ادب ہے، یہاں تعلیم، سماجیات، علوم و فنون اور لسانیات سب ہی اردو صحافت کا موضوع بنتے رہے ہیں، ملی مسائل کے لیے دل دھڑکتے رہے ہیں، زبان کی زلف گرہ گیر کو سلجھانے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں، اسعد فیصل فاروقی نے یہ دستاویزی ثبوت پیش کرنے کے لئے بڑی عرق ریزی کی ہے، انہوں نے ایک طرف صحافت سے متعلق کتب کا مطالعہ کیا ہے تو دوسری طرف علی گڑھ سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کو تلاش کر دیکھا ہے۔ پڑھا ہے اور پھر جائزہ پیش کیا ہے، یہ کتاب اردو صحافت کی تاریخ میں ایک خوبصورت، گراں قدر اور مستند اضافہ ہے، مستقبل کے محققین اس کتاب کو اپنی تحقیقات کے لیے مرجع بنائیں گے، اور اس کتاب کے باعث علم و تحقیق کے نئے باب وا ہوں گے۔

☆☆☆

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ایک خط ان کی درخشاں سیرت اور حسن عمل کی ایک زریں عملی مثال

پروفیسر عبدالحلیم قدوائی

مولانا علی میاںؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے مابین گہرے علمی اور خاندانی تعلق کی شہادت مولاناؒ کی تصنیف پرانے چراغ اور مولانا دریابادیؒ کی آپ بیتی اور معاصرین میں ملتی ہے کہ ان دونوں اکابرین نے ایک دوسرے کی خدمات جلیلہ کو دلکش ادبی پیرائے اور فرط تعلق کے ساتھ خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مولانا دریابادیؒ کے نواسے پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، شعبہ انگریزی اور ڈائریکٹر یو جی سی سینٹر، مسلم یونیورسٹی نے دونوں خاندانوں کے درمیان اس تعلق اور علم وفضل کی روایت کو اس طور پر استوار اور مستحکم کیا کہ ان کو مولانا علی میاںؒ کی متعدد گراں قدر تصانیف کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور یہ تراجم انگلستان سے شائع ہوئے۔ ۱۹۹۴ء پروفیسر قدوائی کے ۱۰ سالہ بیٹے عبدالحلیم قدوائی نے ازراہ عقیدت مولانا علی میاںؒ کو درج ذیل عریضہ روانہ کیا:

بسم اللہ

محترمی حضرت مولانا علی میاں صاحب قبلہ،

السلام علیکم،

پہلے میں اپنا تعارف کرادوں۔ میں عبدالعلیم، قدوائی صاحب کا پوتا ہوں اور میرے والد صاحب عبدالرحیم قدوائی صاحب ہیں۔ میری عمر ۱۰ سال ہے۔ اور میں پانچویں درجے کا طالب علم ہوں۔ مجھے آپ سے بہت عقیدت ہے اور چونکہ آپ نے میری بسم اللہ کرائی، اس لیے مجھے آپ سے اور بھی زیادہ عقیدت ہے۔

آپ کا میں بہت شکرگزار ہوں گا اگر آپ مجھے نصیحت کریں جس سے میں آپ کے نقش قدم پر چل سکوں اور آپ کے اچھے کاموں کو پھیلاؤں۔

آپ کا جواب میرے لئے بہت خوشی کا باعث ہوگا۔

والسلام،

خاکسار

عبدالحلیم قدوائی

خداحافظ

اپنی تمام تر مصروفیات کے باوصف مولاناؒ نے اس بچے کو مندرجہ ذیل جواب سے سرفراز کیا:

عزیز القدر عبدالحلیم قدوائی سلمہ اللہ ورقاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، آنعزیز کا سعادت نامہ ملا، آنعزیز کے خاندان سے محبانہ وعزیزانہ تعلق ہے اور فخر خاندان مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے تو نیازمندانہ اور عقیدت مندانہ تعلق ہے۔ وہ بھی بہت شفقت فرماتے تھے، خدا کرے یہ تعلق آئندہ نسلوں میں بھی باقی اور عزیز رہے۔

آنعزیز اپنے خاندان کے خصوصیات وروایات کی حفاظت کریں، اور علم واخلاق وعمل میں اپنے بزرگوں کا نائب وجانشین بنیں۔

راقم بھی آپ کے لئے دعا کرے گا۔

والسلام

دعاگو

ابوالحسن علی ندوی

۴ رفروری ۱۹۹۹ء

مولاناؒ کے گرامی نامے میں شفقت اور تلطف کے پہلو بہ پہلو آئندہ نسل میں دین کی خدمت اور علم اور اخلاق میں درجہ کمال پانے کی شدید اور مخلصانہ خواہش قابل ذکر ہیں۔

اسلامی حسن معاشرت، دینی تربیت اور صالح روایات کی پاسداری کا یہ بہترین نمونہ مولانا علی میاںؒ کی عظیم شخصیت اور ان کے اخلاق کریمانہ کا عکاس ہے۔

بفضلہ تعالیٰ مکتوب نگار عبدالحلیم قدوائی اب امریکہ کی میسا جوٹیس یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات میں ٹیچنگ اسسٹنٹ ہیں انہوں نے مسلم یونیورسٹی سے بی اے معاشیات اور ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ، بمبئی سے ایم اے معاشیات امتیاز کے ساتھ کیا۔

☆☆☆

آخری صفحہ

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

(م۔ق۔ن)

دمشق کے ایک معروف اشاعتی ادارہ ''دارابن کثیر'' نے دنیا کے بلند پایہ علما کے تعارف پر کتابیں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔اس کے پانچویں جز کی اشاعت ۱۹۹۸ء میں ہوئی جس میں ۳۷۵ صفحات میں سید عبدالماجد غوری کی ترتیب کردہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (علی میاں ندویؒ) کی سوانح شائع کی گئی ہے۔اس کتاب کے مقدمہ میں دمشق یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے سابق سربراہ ڈاکٹر مصطفیٰ سعید الحق نے مولانا علی میاں کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ مولانا موصوف ۱۹۵۶ء میں دمشق یونیورسٹی کی دعوت پر ''رجال الفکر والدعوۃ'' کے عنوان پر محاضرات پیش کرنے کے لئے دمشق تشریف لائے تو یونیورسٹی کی طرف سے ایک نہایت شاندار ہوٹل میں آپ کے قیام کا نظم کیا گیا۔مگر آپ نے یونیورسٹی کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا بلکہ سادگی اور تواضع کے ساتھ ایک مسجد کے حجرے میں قیام پسند فرمایا، تا کہ عبادت والا ماحول میسر رہے اور پھر اس شان سے محاضرات پیش کئے کہ پورے ملک میں دھوم مچ گئی۔ان محاضرات کی کامیابی میں مولانا مرحوم کی انابت اِلی اللہ کو بڑا دخل تھا۔(ندائے شاہی مارچ ۲۰۰۰ء)۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تقریر وتحریر وعظ ونصیحت اور پند وموعظت میں نہ صرف اثر اندازی کی باطنی طاقت بلکہ ظاہری آب وتاب بھی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب تقریر وتحریر مقرر ومحرر کے صرف ''قال'' کی ترجمان نہ ہو، بلکہ حال کی عکاس ہو۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے اس طرزِ عمل سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اصلاحِ امت کے لئے داعی ومبلغ اور مصلح وناصح کے اندر عمل کی بھرپور طاقت اور خلق خدا کی خدمت کا سچا جذبہ ہو۔

تاریخ شاہد ہے اور مصلحین امت کی سیرت وسوانح پڑھنے سے یہ بات بخوبی عیاں اور بیاں ہوتی ہے کہ جو داعی اور مبلغ بھی عمومی دعوت لے کر اٹھا ہے۔اور اس کی دعوت میں مرکزیت اور ہمہ گیری آئی ہے وہ عمل اور ذوقِ عبادت اور جذبۂ خدمت کے اعتبار سے امتیازی مقام پر فائز تھا۔اسی کثرتِ عبادت نے اس کی زبان وقلم میں وہ اثر انگیزی پیدا کی کہ زندگی ہی میں نہیں بلکہ وفات کے بعد بھی اس کا فیض محسوس طور پر جاری رہا۔

جو داعی ان صفات سے متصف ہوگا اور گفتار سے زیادہ کردار کا غازی ہوگا۔اس کی زبان سے نکلنے والے چند سادے اور بے ربط کلمات بھی ایسا اثر رکھیں گے کہ بڑے بڑے فصحاء وبلغاء کی لمبی لمبی لچھے دار تقریروں میں بھی وہ تاثیر نہیں ہوگی۔

آج مقرروں اور واعظوں کی کمی نہیں ہے اور نہ ہی علم اور معلومات کی کمی ہے، بلکہ کمی ہے کردار کی، عمل کی، روح کی، اخلاص کی، خونِ جگر کی، للّٰہیت کی، خلوص کی، قوتِ عمل کی، جب تک یہ چیزیں پیدا نہ ہوں گی تاثیر کبھی پیدا نہیں ہوگی۔اقبال نے سچ کہا ہے ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

☆☆☆